امام شاہ ولی اللہؒ دہلوی

کے

افکار اور عصر حاضر

چار روزہ خطبات ملتان

از

مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

موسیٰ پاک شہید چیئر شعبہ علوم اسلامیہ
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ

کے

افکار اور عصر حاضر

(چار روزہ خطبات)

از

مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

نظر ثانی

پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعیدالرحمن

زیر اہتمام

موسیٰ پاک شہید چیئر شعبہ علومِ اسلامیہ

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

کتاب: امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصر حاضر

خطبات: مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

کمپوزنگ: سید مبارک نفیس ھمدانی

مسودہ خوانی: محمد امداد اللہ دانی

طبع اول: جنوری 2019ء

زیر اہتمام: موسیٰ پاک شہیدؒ چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

ISBN 978-969-7899-03-6

مطبع:

تعداد:

☆

مندرجات

صفحہ نمبر

پیغام رئیس الجامعہ	پروفیسر ڈاکٹر طارق محمود انصاری	5
تعارفی کلمات	پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن	9
☆ امام شاہ ولی اللہ کی شخصیت اور فکر: ایک تعارف	مولانا مفتی عبد الخالق آزاد رائے پوری	15
سوالات وجوابات		45
صدارتی کلمات	پروفیسر ڈاکٹر عبد القدوس صہیب	51
☆ امام شاہ ولی اللہ دہلوی کا نظریہ اسرار دین	مولانا مفتی عبد الخالق آزاد رائے پوری	55
سوالات وجوابات		90
صدارتی کلمات	پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبد الرحیم	97

صفحہ نمبر

مندرجات

☆ امام شاہ ولی اللہ دہلوی کا نظریہ معیشت　مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری　99

سوالات و جوابات　123

صدارتی کلمات　پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا　133

تمہیدی کلمات　پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن　137

☆ امام شاہ ولی اللہ دہلوی کا نظریہ ارتفاقات　مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری　141

سوالات و جوابات　162

صدارتی کلمات　پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد چوہدری　167

پیغام وائس چانسلر

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

تمام تعریفیں اللہ پاک، بزرگ و برتر کے لئے جس نے انسان کو قوت گویائی بخشی اور اسے اپنی پسندیدہ راہ کا شعور عطا کیا اور بے شمار صلاۃ وسلام اس ذات بابرکات پر، جس نے جہانوں کو اپنی رحمت سے منور کیا، انسانیت کو ذلت سے نکال کر اس کو اوج ثریا کی جانب رہنمائی بخشی اور جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت رسالت کی تکمیل کر کے مہر ثبت کر دی نیز ان تمام برگزیدہ شخصیات پر بے پایاں رحمتیں، جنہوں نے ہر دور میں دین حق کی بے لوث اور دانائی سے بھرپور خدمت کی اور بارگاہ الٰہی میں سرخرو ہوئے۔

مجھے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ موسیٰ پاک شہید چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے زیر انتظام ان لیکچرز کی اشاعت عمل میں لائی جا رہی ہے، جو چیئر کے زیر اہتمام ملک کے نامور عالم دین اور صاحب دانش شخصیت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری نے اپریل 2017ء میں پیش کئے تھے، جامعات کا مقصد نہ صرف اپنے مقررہ نصابی اہداف کی تکمیل ہوتی ہے بلکہ طلبہ و طالبات میں علم و شعور کو منتقل کر کے معاشرہ کے لئے ان کو متحرک رہنما کردار کی ادائیگی کی مطلوبہ اخلاقی و سماجی تربیت مہیا کرنا بھی ہوتا ہے، اس کے لئے جہاں معمول کی علمی سرگرمیاں اہمیت رکھتی ہیں وہاں وہ توسیعی لیکچرز بھی اپنے اندر غیر معمولی افادیت رکھتے ہیں جو مختلف شعبوں کے ماہر تجربہ کار اہل علم و دانش پیش کرتے ہیں۔

توسیعی لیکچرز، درحقیقت سالہا سال کے مطالعہ اور سکالرز کے تفکر مسلسل کا حاصل ہوتے ہیں جن سے نژادنو کو اپنے شعوری دریچوں کو کم سے کم وقت میں نہایت عمدہ طریقہ سے وا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ خطبات اس کا منہ بولتا ثبوت

ہے کہ فاضل سکالر نے عہد حاضر کی نابغہ شخصیت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر کے اہم گوشوں کو نہایت عالمانہ انداز میں سامعین تک منتقل کیا ہے۔ انہوں نے شاہ صاحب کی فکر کی عصری معنویت کو اجاگر کر کے ذہنوں پر کم علمی کی وجہ سے چھا جانے والی مرعوبیت دور کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس مجموعہ لیکچرز کو علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہو گی۔ اس کی اشاعت شعبہ علوم اسلامیہ کے لئے باعث اعزاز ہے۔

ان لیکچرز کے انعقاد اور ان کی اشاعت پر موسیٰ پاک شہید چیئر کے ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کی کاوشوں سے علوم اسلامیہ میں دلچسپی رکھنے والے اساتذہ، طلبہ و طالبات اور دیگر خواتین و حضرات کو دین اسلام کے حوالہ سے اور بالخصوص امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نقطۂ نظر سے بہتر طور پر آگہی کا موقع ملا اور یہ توقع رکھتا ہوں کہ شعبہ علوم اسلامیہ میں اس سطح کے علمی لیکچرز کے انعقاد کو ہر تعلیمی سال کے کیلنڈر کا مستقل حصہ بنایا جائے گا، اس سے معروف صوفی بزرگ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے نام سے منسوب جنوبی پنجاب کی عظیم درس گاہ کو فروغ علم و ہنر کے اپنے قومی مشن کو کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی سرگرمیوں کو مزید با مقصد اور مفید تر بنانے میں مدد ملے گی۔

یونیورسٹی انتظامیہ یقین دلاتی ہے کہ وہ ملک کی ترقی و استحکام کے لئے ریاستی و سماجی اداروں کے شانہ بشانہ اپنے قومی فرائض کی تکمیل کے لئے جواں عزم اور مسلسل سرگرم عمل رہے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو

پروفیسر ڈاکٹر طارق محمود انصاری
وائس چانسلر
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

☆

پہلا لیکچر

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ
کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف

مؤرخہ 17 اپریل 2017ء بروز سوموار

صدارت

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب

چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

نظامت

پروفیسر ڈاکٹر فریدہ یوسف

شعبہ علومِ اسلامیہ، زکریا یونیورسٹی، ملتان

تلاوتِ قرآن کریم

حافظ محمد وسیم عارف

ایم فل سکالر

نعتِ سیّد المرسلین ﷺ

حافظ محمد رفیق

ایم فل سکالر

☆☆☆☆☆☆☆

تعارفی کلمات

پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

(مسئول موسیٰ پاک شہید چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان)

نحمدهٗ و نصلّی علیٰ رسوله الکریم. امّا بعد!

جناب محترم صدر مجلس ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب اور آج کے مہمانِ خصوصی محترم حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری صاحب، معزز اساتذۂ کرام اور عزیز طلبا و طالبات!

چند مختصر باتیں عرض کروں گا، تا کہ اس کے بعد باقاعدہ لیکچر کا آغاز ہو سکے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس لیکچر سیریز کا اہتمام موسیٰ پاک شہید چیئر کے تحت ہو رہا ہے۔ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ سولہویں صدی عیسوی کی شخصیت ہیں۔ خانوادہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے تعلق ہے۔ ان کا اس خطے میں ایک بہت بڑا حصہ (contribuion) ہے۔ جہاں تصوف میں ان کا کام ہے، وہاں وہ معاشرتی اور سماجی زندگی سے بھی وابستہ تھے۔ جلال الدین اکبر کا دور تھا اور اس کے دور میں حکومت سے ان کا باقاعدہ تعلق رہا ہے۔ اس طور پر نہیں کہ اس حکومت کے محض آلہ کار تھے، یقیناً اُن کے پاس سرکاری منصب تھا، لیکن کبھی بھی کسی شرعی مسئلے پر انھوں نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہمیں ان کی زندگی میں ایک متوازن شخصیت ملتی ہے۔

آج سے سات سال پہلے 2010ء میں اس چیئر کا یونیورسٹی میں باقاعدہ اعلان ہوا تھا۔ جب اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم جناب یوسف رضا گیلانی تھے۔ اس چیئر کے تحت ابھی تک موسیٰ پاک شہیدؒ کے حوالے سے، ان کے تذکرے کے عنوان سے کتاب شائع ہو چکی ہے اور اسی طرح اور بھی کچھ کام ابھی زیر ترتیب ہیں۔

آج کی یہ نشست امام شاہ ولی اللہ کے حوالے سے ہے کہ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ سے علمی طور پر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا بھی تعلق ہے۔ علمی سلسلہ اس طرح بنتا ہے کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (1762ء) کے والد شاہ عبدالرحیم دہلویؒ، (1791ء) اُن کا سلسلۂ شیخ ابو رضا محمد دہلویؒ (1690ء) سے اور ان کا سلسلۂ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (1642ء) سے اور پھر ان کا

حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ (1602ء) سے۔ واضح رہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہماری تاریخ کا بہت بڑا نام ہے۔ اُن کی بہت سی تصانیف ہیں۔ علمی طور پر اُن کا بہت بڑا مقام ہے۔ وہ چار سال تک ملتان میں اپنے شیخ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے پاس رہے، جس سے ہمیں ان کے اس روحانی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے جو اُن کا اپنے شیخ کے ساتھ تھا۔

اس چیئر کے تحت آج یہ پروگرام جس شخصیت یعنی حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ پر ہو رہا ہے، ان کا نام تو آپ نے کافی سنا ہے۔ تقریباً ہمارے جتنے بھی مضامین (subjects) ہیں، مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، سب میں ان کا اور ان کی خدمات کا ذکر ہے۔

اس لیکچرز سیریز کا مقصد بنیادی طور پر یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی اُس فکر سے آگہی حاصل کی جائے، جس کا تعلق سماج کی تشکیل سے ہے کہ انھوں نے سوسائٹی کی نئی تشکیل کے لیے کیا افکار پیش کیے، کیوں کہ اُن کے دور میں سماج ٹوٹ رہا تھا۔ ایسے میں ایک نئے سماج کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نئے سماج کے لیے انھوں نے کیا بنیادی رہنما اصول دیے؟ موضوع خاصا وسیع ہے اور یقیناً اس سیریز سے اس کا پورا حق تو ادا نہیں ہوگا، لیکن سرِ دست یہی ممکن تھا کہ چار موضوعات پر سیریز کا انعقاد کیا جائے۔ انشاء اللہ ممکن ہوا تو دیگر موضوعات کے حوالہ سے بھی کسی اَور موقع پر اس کا اہتمام ہوگا۔

محترم خواتین وحضرات!

اس چیز کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ یقیناً ہماری تاریخ بہت ہی بھرپور (rich) تاریخ ہے۔ اور تاریخ اسلام کا موضوع یقیناً اپنی جگہ ایک بڑا بھرپور موضوع ہے۔ اس تاریخ میں یقیناً بہت بڑی شخصیات آئیں۔ بڑے بڑے نام ہیں۔ اور ہر شخصیت کا اپنے دور میں ایک بہت بڑا کردار ہے۔ اُس کے کردار پر، اُس کے کام پر اگلے دور کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ یہ ایک تاریخ کا تسلسل ہے۔ اور تاریخی تسلسل کو سمجھے بغیر ہم علوم سے کسی طور پر بھی واقف نہیں ہو سکتے۔ چاہے طبعی علوم (naturel sciences) ہوں، یا سماجی علوم (social sciences) ہوں، ہر علم کا ایک ارتقا ہے۔ وہی ارتقا اگلے دور میں لے کر جاتا ہے۔ اگر کوئی بھی اس ارتقا کا انکار کر دے اور آغاز سے کام کی تدوین کرے گا تو وہ اپنی چھوٹی سے عمر میں یہی کچھ کر پائے گا، جو پہلے سے ہو چکا ہے اور کوئی اضافہ نہیں کر پائے گا۔ آگے بڑھنے کا ہمیشہ راستہ یہی ہوتا ہے کہ تاریخ میں جو ورثہ ہے ہمارے پاس؛ علمی حوالے سے، فکری حوالے سے۔ اس کو سمجھا جائے اور اس کو آگے بڑھنے کے لیے بہ طور بنیاد کے متعین کیا جائے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ پچھلے ایک ہزار سال سے زائد کے اس

ورثے کے اگلے دور میں منتقل کرنے کے محرک بنے۔ انھوں نے سارے ورثے کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔ اُن کا ورثہ پچھلے تمام اہلِ علم، اہلِ بصیرت، اہلِ اخلاص، اہلِ شعور کے علوم کا خلاصہ ہے۔ تو ہمیں ایک چیز یہ سمجھنی ہے کہ شاہ صاحبؒ کا ذکر کوئی تاریخ سے کٹ کر نہیں ہے، بلکہ تاریخی تسلسل کے اور تاریخی ارتقا کے ایک اہم مرکز کے طور پر ہو رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری اس طرح کی سوسائٹی ہے، جو بُری طرح مذہبی طور پر تقسیم ہے۔ شاہ صاحبؒ کا ذکر بہت زیادہ ضروری ہے کہ ایک ایسی شخصیت کہ جس پر ہمارے آج کے دور کے جو مروّج فرقے ہیں، وہ ان کی شخصیت پر متفق ہیں۔ وہ اپنا علمی سلسلہ وہیں تک پہنچاتے ہیں۔ تو کیوں نہ اس شخصیت سے اور ان کی فکر سے براہِ راست آگہی حاصل کی جائے، تاکہ یہ جو بعد کے مسائل ہیں، ان کو ہم صحیح طور پر سمجھ سکیں، بعد کی گروہیتوں سے نکل سکیں اور ان فرقوں سے اوپر اٹھ سکیں۔ شاہ صاحبؒ کی شخصیت گویا کہ سوسائٹی کے، معاشرے کے مختلف گروہوں کے جوڑ کا ذریعہ ہے۔ اس لیے ان کا تذکرہ نہ صرف ہونا چاہیے، بلکہ اُن کی فکر کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ سارے مسائل سمجھ بھی آجاتے ہیں اور ان مسائل کو حل کرنے کی ہمیں نوید بھی ملتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ جس دور میں آئے تھے، وہ دورِ زوال ہے۔ دورِ زوال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے، دیکھتا ہے، تجزیہ کرتا ہے، یقیناً اس کا اسلوبِ بیان اس دور کے لوگوں سے مختلف ہوگا، جو دورِ عروج ہوگا۔ وہ اسلوب آپ کو امام غزالیؒ کے ہاں نہیں ملے گا۔ امام رازیؒ وغیرہ کے ہاں نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ وہ دورِ عروج کے لوگ ہیں اور اپنے اپنے شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ جس شعبے کی تجدید کی ضرورت وہ محسوس کر رہے تھے، یقیناً اس میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ شاہ صاحبؒ جس دور میں آئے، یہ زوال کا دور ہے۔ مذہبی طور پر بھی، سماجی طور پر بھی، سیاسی طور پر بھی۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ وہ زوال آج تک پہنچا ہوا ہے اور کوئی تبدیلی نہیں آسکی۔ اس صدی کا جو بھی تجزیہ ہے، وہ آج بھی اسی طرح متعلقہ (relevant) ہے، جیسے اُن کے اپنے دور میں تھا۔

چوتھی بات یہ کہ شاہ صاحبؒ اس خطے کے آدمی ہیں، برصغیر کی شخصیت ہیں، برصغیر کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور برصغیر کے اندر جو بھی مختلف مذہبی اور مختلف ثقافتی نوعیتیں ہیں، اس سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہم کسی باہر کے مفکر کو اگر پیش بھی کریں گے تو اس کا فکر اپنی جگہ پر کتنا ہی اچھا ہو، وہ ہمارے اس ماحول سے متعلق نہیں ہوگا۔

ہمارے ہاں مغرب کا فکر پڑھایا جاتا ہے۔ بجا طور پر بہت سارے نام ہیں، مثلاً روسو (1778ء) پڑھایا جا رہا ہے، ایڈم سمتھ (1790ء) پڑھایا جا رہا ہے، کارل مارکس (1883ء)

پڑھایا جارہا ہے۔ ٹائن بی (1975ء) پڑھایا جارہا ہے۔ اس طرح بہت سارے لوگوں کے ہمارے نصاب میں نام موجود ہیں۔ یہ جتنے بھی لوگ ہیں، مغرب کے ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولیں، مغرب کے ماحول کو دیکھا، وہاں کے مسائل کو پڑھا اور وہاں کے مسائل کا تجزیہ کیا۔ قطع نظر اس کے کہ ان کا نظریہ کس قسم کا ہے۔ یہ ایک علاحدہ موضوع ہے۔ اس کے مقابلے پر شاہ صاحبؒ یہیں پیدا ہوئے، یہیں پر رہے اور یہاں کی جو بھی سیاسی وسماجی کشمکش ہے، اس کا حصہ رہے۔ اس دور کے اندر جو فکری طور پر مسائل تھے، ان کی پوری طرح آگہی موجود ہے۔ وہ ایک وطنی (indigenous) مفکر ہیں۔ بیرونی (foreigner) مفکر کا جو بھی فکر ہے، وہ یقیناً درآمد شدہ ہوتا ہے کہ باہر سے آیا ہے۔ ہمیں یہاں کے مفکر کی بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسی طرح ایسے مسلم مفکر جو کسی اَور علاقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا بھی یقیناً بہت کردار (contribution) ہے۔ ان سے بھی استفادہ ہوتا ہے۔ لیکن بات وہیں آجاتی ہے کہ کسی بھی مسلم علاقے کا مفکر، ہمارے اس مزاج کو اس طرح نہیں جانتا، جس طرح یہاں کا مفکر سمجھتا ہے۔ اس لیے ہمیں ایک قومی مفکر کی رہنمائی کی ضرورت ہے جو یہاں کے قومی مسائل کو سمجھتا ہو، یہاں کی ثقافت کو سمجھتا ہو، یہاں کے مذہبی تنوع کو جانتا ہو، برصغیر کے مسائل پر گہری نظر رکھتا ہو، وہ یہاں کے مسائل کا حل پیش کرتا ہو اور دنیا کے کسی بھی کلچر، کسی بھی ثقافت کے حوالے سے اُس کی فکر سے پوری طرح استفادہ ہوسکے۔

کچھ مفکرین ایسے ہیں، جو کسی ایک ہی خاص ثقافت میں رہے ہیں، وہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے اور ایک ہی مذہب کے لوگ وہاں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اُن کی گفتگو، اُن کے تجزیے میں آپ کو وہ تنوع (veriety) نظر نہیں آئے گی، جو ہمیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر میں نظر آتی ہے۔ کیوں کہ یہاں کی سوسائٹی کثیر الثقافتی (multicultural) ہے۔ یہاں بہت ساری صداقتیں رہی ہیں، بہت سارے مذاہب ہیں، بہت ساری زبانیں ہیں۔ برصغیر کو مولانا عبیداللہ سندھیؒ برعظیم کہا کرتے تھے۔ کہ جو اس کا جغرافیہ ہے، جو اس کا تنوع ہے، وہ ایک براعظم سے کم نہیں ہے۔ گو اصطلاحی طور پر ہم اس کو براعظم نہیں کہہ سکتے، لیکن وہ براعظم سے کم نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ دیکھیں آسٹریلیا براعظم ہے حالانکہ برصغیر کے مقابلے میں اُس کی کیا حیثیت ہے؟ تو برعظیم ہند ایک ایسا علاقہ ہے کہ اس علاقے کا جو بھی مفکر ہوگا، اس کی جو سوچ ہوگی، وہ کثیر الجہات ہوگی۔

اس لیے یہ جو ہماری علمی نشستیں ہیں، یہ کسی گزرے ہوئے دور کو ہم آواز نہیں دے رہے کہ ایک دور تھا، جس میں بڑے اچھے لوگ تھے، کوئی بڑی اچھی شخصیت تھی، ان کو ہم خراجِ عقیدت پیش

کر رہے ہیں یا مذہبی زبان میں اُن کا کوئی عرس پڑھا جا رہا ہے۔ قطعاً نہیں! اس موضوع کو ہم نے اس طرح سننا ہے کہ یہ آج کا موضوع ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جو گفتگو کی ہے، انھوں نے ایک منہج (method) بھی دیا ہے کہ چیزوں کو کس طرح سوچا اور دیکھا جاتا ہے۔ اور یقیناً وہ منہج استعمال ہوتا رہے گا۔ اس لیے جو گفتگو یہاں پر ہو رہی ہے، اس میں صرف شاہ صاحبؒ کا ذکر نہیں، بلکہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا بھی ذکر آتا ہے۔ شاہ رفیع الدین دہلویؒ کا بھی ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا بھی ذکر آتا ہے۔ مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ کا بھی ذکر آتا ہے۔ یہ ایک سکول آف تھاٹ ہے، ولی اللّٰہی سکول آف تھاٹ۔ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے کتنا اتفاق کریں، یا کتنا اختلاف کریں، یہ ایک علاحدہ موضوع ہے۔ لیکن پہلے اس کو جاننا ضروری ہے کہ وہ ہے کیا؟

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ان چیزوں کو ضرور ذہن میں رکھیں کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جو شخصیت ہے، محض عقیدت کی طور پر اُس کا ذکر یہاں پر مقصود نہیں ہے۔ کیوں کہ عقیدت مند بہت ہیں اور کوئی کسی کی عقیدت کو چیلنج بھی نہیں کر سکتا۔ بات یہ ہے کہ اُن کی فکر کے اندر کون سے پہلو ہیں، کون سی جہات ہیں کہ جن سے ہم آج کے اس ماحول میں، اس دور میں، اس ملک میں اس سے استفادہ کر کے، اس سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں اور آج کے مسائل کے لیے کوئی بہتر راہِ عمل تجویز کر سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اُن کی فکر جو بھی ہے، وہ دین اسلام ہی پر مبنی ہے۔

آج بہت ساری باتیں ہمارے فکر میں یوں شامل ہو جاتی ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں آدمی، فلاں آدمی سے یا فلاں جگہ سے متاثر ہے، تو شاہ صاحبؒ کی یہ بات بھی نہیں ہے۔ ان کے دور میں نہ تو موجودہ دور جیسا کیپٹل ازم ہے، نہ وہ اس طرح کا سوشلزم ہے، نہ اس طرح کی جمہوریت ہے، یہ سب چیزیں بعد کی ہیں۔ تو اس لیے وہ کوئی بات کریں گے تو پھر تو یقیناً اُن پر یہ پھبتی بھی نہیں کسی جا سکتی کہ وہ کسی نظام سے متاثر ہیں۔ اُن کا اپنا علم، مطالعہ، تربیت، مشاہدہ اور چیزوں پر غور و فکر ہے۔ عقل کا استعمال، نقل سے استفادہ، کشف و وجدان کے ذریعے چیزوں کا پرکھنا، اور ان کو جانچنا ہے یہ سب چیزیں گویا ان کے علم کے ذرائع ہیں۔

اس مقصد کے لیے جس شخصیت کو آج ہم نے مدعو کیا ہے، میرے علم کے مطابق اس وقت پاکستان میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر پر اور ان کی تصانیف پر ان سے زیادہ کسی کی گہری نظر نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری صاحب، اُن کی کتابوں کا نہ صرف خود ادراک رکھتے ہیں، بلکہ باقاعدہ ان کتابوں کی تدریس بھی کرتے ہیں۔ ان کتابوں پر براہِ راست ان کی بڑی گہری نظر

ہے، اور محض کتابی نظر نہیں، بلکہ آج کے حالات کے اعتبار سے اس فکر کا اطلاق (application) کیا ہے؟ اس پر بھی ان کی نظر ہے۔ شاہ صاحبؒ کا پس منظر اور پیش منظر دونوں چیزیں ان کے سامنے بہت واضح ہیں۔ ان شاء اللہ جب آپ ان کے لیکچرز سنیں گے تو یقیناً آپ کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔

وہ اس وقت ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ اس ادارے کے تحت ان کی کئی تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں اور کئی ایک کتابوں کے تراجم وہ کر چکے ہیں۔ صاحب تصنیف وتالیف ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ طریقت بزرگ بھی ہیں۔ خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور ایک بہت معروف علمی وروحانی خانقاہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا سماجیات وسیاسیات سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر آپ تحریکِ ریشمی رومال کی تاریخ کو پڑھیں گے تو اس میں بھی اس خانقاہ کے بنیادی کردار کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ محض ایک روایتی خانقاہ نہیں ہے، بلکہ اگر اس کے اندر جہاں ذکر ہے، وہاں فکر بھی ہے۔ علم بھی، عقیدت بھی ہے اور شریعت کی گفتگو بھی ہے۔ طریقت کے موضوعات پر بات چیت ہے۔ جو علمی سیاست ہے، اس پر گفتگو بھی ہے۔

آج کی سب بڑی ضرورت، جس کی آج ہمیں سوسائٹی میں کمی محسوس ہوتی ہے، وہ فکر اور بصیرت کی ہے۔ اسلام کے حوالے سے ہمارے ہاں تحریکی مزاج تو بہت ہے، اس پر بہت سا کام ہوا، بہت سے لوگ اس پر کام کر بھی رہے ہیں، لیکن جس چیز کی بہت بڑی کمی ہے، وہ فکر کی اور بصیرت کی ہے۔ اور جب تک فکر وبصیرت نہ ہو تو اس کے بغیر تحریکیں جذبات کا شکار ہوتی ہیں، حالات کا شکار ہوتی ہیں، جمود کا شکار ہوتی ہیں، ردِّ عمل کا شکار ہوتی ہیں چنانچہ آج ہم سوسائٹی میں انہی چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔

ان شاء اللہ اس لیکچر سیریز سے آپ کو بہت کچھ سننے کا، سمجھنے کا اور غور وفکر کرنے کا موقع ملے گا۔ میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی طرف سے لیکچر سیریز کی دعوت قبول کرنے اور اپنے قیمتی اوقات عطا کرنے پر محترم مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری کا شکر گزار ہوں اور ان کے ساتھ تشریف لانے والے مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی اور مولانا محمد مختار حسن کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے لیکچرز سیریز میں خصوصی طور پر شرکت کی، اسی طرح جناب سید سبطین رضا گیلانی سمیت شہر سے تشریف لانے والے حضرات اور یونیورسٹی کے دیگر شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے اساتذہ وتلامذہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(مذکورہ مضمون 17 اور 19 اپریل کے لیکچرز سے قبل کی تعارفی گفتگو پر مشتمل ہے۔)

پہلا لیکچر

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ
کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف

نحمدهٗ و نصلّی علیٰ رسولہِ الکریم. اما بعد! فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم.

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ: لقد ارسلنا رُسلنا بالبیّنات و أنزلنا معھم الکتاب و المیزان، لیقوم النّاس بالقسط. (القرآن) و قال النّبیّ صلّی اللّٰہ علیه و سلّم: ”کانت بنو إسرائیل تسوسھم الأنبیاء، کلّما ھلک نبیّ خلفهٗ نبیّ آخر. ألا! لا نبیّ بعدی، سیکون بعدی خلفاء فیکثرون.“ و قال النّبیّ صلّی اللّٰہ علیه و سلّم: ”لا تزال طائفة من اُمّتی قائمین علیٰ الحقّ، لا یضرّھم من خالفھم.“ و قال النّبیّ صلّی اللّٰہ علیه و سلّم: ”إنّ اللّٰہ یبعث لھٰذہ الاُمّة علیٰ رأس کلّ مائة سنة من یجدّد لھا دینھا.“ صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولهٗ النّبیّ الکریم.

کلماتِ تشکر

محترم حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب (مسئول موسیٰ پاک شہید چیئر)، محترم جناب ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب (صدر شعبہ علومِ اسلامیہ)، معزز اساتذۂ کرام، علمائے کرام، طلبائے عظام اور معزز بہنوں اور بھائیو!

سب سے پہلے تو میں اپنی تمام تر کم علمی اور کوتاہی کے باوجود آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ اہل علم کی اس محفل میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت، افکار و تعلیمات اور عصرِ حاضر میں اس کی ضرورت پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ علم و فکر کے مراکز میں علمی گفتگو، علمائے ربانیین کے تذکرے اور ان کے افکار و تعلیمات سے آگہی یقیناً شمع علم کو فروزاں کرنے کا باعث بنتی ہے۔ انسانی سوسائٹی کی ترقی، علوم ہی کے سبب سے ہوتی ہے۔ جتنے اونچے درجے کا علم اور نالج (knowledge) ہوتا ہے، اتنا ہی معاشرے ترقی کرتے ہیں۔ جہاں علمی پستی، علمی اور فکری افلاس پایا جاتا

ہے اور جہالت کے اندھیرے ہوتے ہیں، ایسے معاشرے زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہر دور میں مجدد کی ضرورت

دین اسلام علم کی شمع روشن کرتا ہے۔ علومِ نبوت اس کی اساس ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر علم و فکر میں حیلہ جُو طبیعتیں بہت سی ایسی چیزیں داخل کر دیتی ہیں، جس سے علم کا اصل چہرہ سامنے نہیں رہتا۔ اسی لیے علوم کو اپنی اصل شکل میں واضح کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ زمانے کا تغیر ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ جس کا انکار ممکن نہیں۔ لحظہ لحظہ بدلتے زمانے کا تقاضا ہوتا ہے کہ سماجی زندگی کے دائرے میں جو جدید مسائل پیدا ہو چکے ہیں ان کا حل تلاش کیا جائے، چناں چہ دینی فکر بھی دَور کے اس تقاضے سے باہر نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے ہر دور کے بدلتے تقاضوں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"ألا! لا نبیّ بعدی، سیکون بعدی خلفاء فیکثرون."

(خبردار! میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ میرے بعد خلفا ہوں گے اور وہ بہت کثرت سے ہوں گے۔)

ایک دوسری حدیث میں ان خلفائے مجددین کا تذکرہ کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إنّ اللّٰہ یبعث لھٰذہ الاُمّة علیٰ رأس کُلِّ مائة من یجدّد لھا دینھا."

(بے شک اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لیے ہر سو سال کے شروع میں ایسے لوگ بھیجے گا، جو اس (اُمت) کے لیے دین کو نیا اور تازہ کرتے رہیں گے۔)

اس ارشادِ نبویؐ سے واضح ہوا کہ ہر دور کے لیے مجدد کا ہونا ضروری ہے، تاکہ مرورِ زمانہ سے دین کے عملی نفاذ کی راہ میں جو رُکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں انھیں دور کیا جائے اور دینی فکر اپنی تمام تر تازگیوں اور لطافتوں کے ساتھ نکھر کر سامنے آجائے۔ اور یوں اس کی سحر انگیز نکہتوں سے پوری انسانیت معطر ہو جائے، اور اس کے فطری ارتقا کا سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے۔

منصبِ مجددیت کی حقیقت اور ذمہ داریاں

مجدد کا کام یہ ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے دور میں ایمانیات کے تقاضوں کی تشریح کرتا ہے۔ اور علومِ نبوت کی روشنی میں اس دور کے فرائض و واجبات اور منہیات (جن چیزوں سے روکا جانا ضروری ہے) کے پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور شریعتِ مقدسہ کو ہر قسم کی رسمی جکڑ بندیوں اور فرقہ پرستیوں سے پاک کر کے خالص علومِ نبوت اور ان کے تقاضوں کی وضاحت کرتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے منصبِ مجددیت کی حقیقت اور ذمہ داریاں واضح کی ہیں اور یہ بتلایا ہے کہ مجدد کون ہوتا ہے۔ اور اس کی ذمہ داریاں اور تقاضے کیا ہیں۔ چناں چہ

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''ایمانی دور کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم عہدہ مجددیت کا منصب ہے۔...اور مجدد ایسے آدمی کو کہتے ہیں کہ جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے علمِ قرآن اور علمِ حدیث کا بڑا وافر حصہ عطا کیا ہو۔ پھر اس کو اطمینان وسکینت کا لباس پہنایا ہو۔ پھر وہ (علومِ نبوت کی روشنی میں) حرام، واجب، مکروہ، مستحب اور مباح کو صحیح طور پر متعین کرتا ہے۔ اور شریعت کو موضوع احادیث سے الگ کر کے صاف طور پر واضح کرتا ہے۔ اسی طرح قیاس آرائی کرنے والوں کے ہر طرح کے خیالات اور افراط وتفریط سے اُسے پاک کرتا ہے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ، لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں اور وہ اس سے علومِ نبوت حاصل کرتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ تقریباً ہر سو سال بعد ایک مجدد یا مجددین کی ایک جماعت ضرور آئے گی، جو علمی اور فکری بنیادوں پر ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات، اختلاف وانتشار یا فطری اضمحلال کو ختم کر کے **علم الجمع بین المختلفات** (مختلف امور میں جمع وتطبیق کا علم) کا کام کرتے ہیں۔ اس طرح دین کے اصل علم وفکر کو، شعور و بصیرت کو انسانیت کے سامنے نکھارتے ہیں۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ؛ اس دور کے ایک عظیم مجدد

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے دور کے ایک عظیم مجدد ہیں، جنھوں نے تجدیدِ دین کا کام کیا ہے۔ اس پر اٹھارہویں صدی سے لے کر اب تک مسلمانوں کے تقریباً تمام فرقے متفق ہیں۔ بلکہ غیر مسلموں کے ہاں بھی علمی اور فکری طور پر دین اسلام کی تعلیمات کے حوالے سے گفتگو ہوتی ہے تو شاہ صاحبؒ کے فکر کی اس مجددانہ اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے مجددیت کا منصب عطا کیا ہے۔ اور مجھے علمی آرا کے حوالے سے موجود اختلافات کو دین اسلام کی اصل تعلیمات اور واقعی حقائق کے تناظر میں سمجھنے اور ان میں جو ممکنہ ابہامات اور مخمصے پیدا ہو چکے ہیں، انھیں دور کرنے کے علم میں کمال دیا ہے۔

شاہ صاحبؒ ''التّفهيمات الإلٰهيه'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''و لـمّا تمّت بی دورة الحكمة، ألبسنی اللّٰه سبحانه خلعة المجدّدية، فعلمتُ علم الجمع بين المختلفات، و علمتُ أنّ الرّأی فی الشّريعة تحريف و فی القضاء مكرمة.''

(جب میرے لیے حکمت کا دور اور مرتبہ مکمل ہو گیا تو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مجھے مجددیت کی خلعت (لباس) سے نوازا۔ پس مجھے معلوم ہوا کہ مختلف آرا کے درمیان جمع وتطبیق کا علم کیا ہے اور میں نے جان لیا کہ شریعت میں ذاتی رائے سے گفتگو کرنا تحریف ہے، جب کہ شریعت کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کے بارے میں فیصلہ کن رائے دینا بڑا اعزاز ہے۔)

بلاشبہ شاہ صاحبؒ نے ایسا مجددانہ علمی اور فکری کام کیا ہے جس نے تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کے شعبوں میں مختلف آرا کو چھان پھٹک کر کے بنیادی علومِ نبوت کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے شریعتِ مقدسہ کو انفرادی آرا پر

بنی خیالات وتصورات سے نکال کر ایک نظام کے تحت مرتب اور منظم کر دیا ہے۔ نیز اس کے عملی سماجی تقاضوں کی نشان دہی کی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے اس علمی اور عملی کام نے ہندوستان میں بسنے والے انسانوں کی فکری، سیاسی اور معاشی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

اس خطے کے لوگوں پر شاہ صاحبؒ کا بہت بڑا احسان ہے، جس کا انکار ممکن نہیں۔ آج ہماری زندگی میں دین متین جس شکل میں محفوظ ہے، وہ دراصل ولی اللّٰہی جماعت کے مجددانہ کام کی بدولت ہی ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ برعظیم (پاک وہند اور بنگلا دیش) اور اس کے اَطراف واَکناف میں جتنے لوگ بھی صحیح دینی مزاج رکھنے والے ہیں، ان کے علم وفکر کا سلسلۂ سند امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہی جا ملتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے علوم کا مطالعہ جامعیت پر مبنی اسی حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔ نہ صرف شاہ صاحب، بلکہ اُن کے بعد اُن کے جانشین حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، پھر شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، حضرت سیّد احمد شہیدؒ، شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، اور پھر ان کے سلسلے کے آگے ولی اللّٰہی بزرگوں نے یہی علمی جامعیت پائی ہے۔ حقیقت میں حق پرست علما وہی ہیں کہ جو مختلف اور منتشر چیزوں کو ایک مربوط اور جامع فلسفہ وفکر کے تحت میں سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

انبیاؑ کے وارث علما کی ذمہ داریاں

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے مکتوبات میں حدیث "**العلماء ورثة الأنبياء**" کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نبی اکرمؐ کے علوم کی وراثت دو پہلوؤں سے ہے۔ باقی علوم تو نبی کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔ اس میں تو وحی یا نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ انبیاؑ کے جاری رہنے والے دو علوم ہیں: علم الاحکام اور علم الاسرار۔ علم الاحکام سے انسانی سوسائٹی کی تشکیل کے بنیادی قوانین اور ضابطے معلوم ہوتے ہیں۔ اس علم میں ان سوالات کے جوابات پنہاں ہوتے ہیں کہ سوسائٹی کو کس رُخ پر آگے بڑھنا ہے؟ اس کا نظم وضبط اور ڈسپلن (discipline)، اس میں احکامات اور قوانین، ضابطے اور قواعد کس نہج پر مرتب ہونے چاہئیں؟ اور دوسرا علم "علم اسرارِ دین" ہے، جس میں علم الاحکام کی حکمتیں اور اَسرار یعنی اس کا مربوط فلسفہ وفکر بیان کیا جاتا ہے۔

حضرت مجدد صاحب نے لکھا ہے کہ جو علما صرف علم الاحکام کے ماہر اور صرف شرعی مسائل بتلا سکتے ہوں اور علم الاسرار نہ جانتے ہوں، وہ حضور ﷺ کے علوم کے پورے وارث نہیں ہیں۔ جو لوگ صرف علم الاسرار پر واقفیت رکھتے ہوں، اور شریعت کے احکامات سے آگاہ نہ ہوں، تو وہ بھی دراصل انبیاؑء کے وارث نہیں ہیں۔ علم الاحکام اور علم الاسرار دونوں علوم کے جامع اہلِ علم انبیاءؑ کے وارث ہیں۔

بلاشبہ مجدد الف ثانیؒ نے جو تجدیدی کام شروع کیا، اس کی تکمیل حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمائی۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت کا مختصر تعارف

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اٹھارہویں صدی کی عظیم ترین شخصیت ہے۔ ۴رشوال ۱۱۱۴ھ/21رفروری

1703ء میں آپؒ پیدا ہوئے۔ اور ۳۰ محرم ۱۱۷۶ھ/ 21/ اگست 1762ء میں آپؒ کا انتقال ہوا۔ آپؒ کی زندگی کا دورانیہ قمری حوالے سے اکسٹھ سال چار مہینے اور شمسی حوالے سے ساٹھ سال سے بھی سات ماہ کم ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی کے اس ساٹھ سالہ تاریخی دورانیے کا تجزیہ کرنا ضروری ہے، تاکہ ان کی شخصیت اور تجدیدی کام کی اہمیت واضح ہو جائے۔ یہ دور وہ ہے کہ جس میں 1707ء کے دوران اورنگزیب عالمگیرؒ کا انتقال ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کا وہ پچاس سالہ سنہرا دور اختتام پذیر ہوتا ہے، جس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ حکومت روبہ زوال رہی اور بالآخر اس کا سقوط ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور شاہ عبدالرحیم دہلویؒ

شوال ۱۱۱۹ھ/ فروری 1708ء میں پانچ سال کی عمر میں مکتب میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے اور سات سال کی عمر میں قرآن حکیم ختم کیا اور دہلی میں مروّجہ نصابِ تعلیم کے مطابق علوم وفنون اور تفسیر و احادیث کی کتابوں کی تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ دس برس کی عمر میں تھے کہ از خود مطالعے سے کتابوں کو حل کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے 15 سال کی عمر میں اپنے دور کے تمام علوم وفنون پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ چناں چہ خود "الجزء اللطیف" میں لکھتے ہیں:

"پندرہ سال کی عمر میں میں نے تمام علوم وفنون پڑھ لیے تھے، اور اسی سال قرآن حکیم میں کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعے کے ساتھ والدِ ماجد کے درسِ قرآن میں حاضری کی توفیق ملی۔ اس طرح کئی بار میں نے حضرت والد ماجد سے متن قرآن پڑھا اور یہی میرے حق میں "فتح عظیم" کا باعث ہوا"

اس طرح انھوں نے دس سال تک اپنے والدِ گرامی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ سے تمام علوم پڑھے۔ کوئی علم نہیں چھوڑا۔ اس طرح حضرت شاہ صاحبؒ پر علومِ قرآنیہ کا دروازہ کھل گیا۔ انھیں قرآن حکیم کا پورا فیضان نصیب ہوا۔ اُن کی شخصیت پر قرآن حکیم کی تعلیم کے اثرات ونتائج مرتب ہوئے۔ بالخصوص وہ فرماتے ہیں کہ:

"میں نے قرآن حکیم کو ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ پڑھا۔ والدِ گرامی کا معمول تھا کہ وہ روزانہ ایک دو رکوع، تمام تفسیروں سے ہٹ کر متنِ قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے تھے اور اُس پر حکمتِ عملیہ یعنی عملی تقاضوں کی روشنی میں گفتگو فرماتے تھے۔ یوں متنِ قرآن حکیم سے فیض حاصل کیا۔"

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے والدِ گرامیؒ سے خاص طور پر حکمتِ عملی کے آداب اور طریقۂ کار سیکھے۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ "انفاس العارفین" میں لکھتے ہیں:

"ایں فقیر را در مجلسِ صحبت حکمتِ عملی و آدابِ معاملہ بسیار مے آموختند۔"

(انھوں نے اس فقیر کو اپنی مجلسِ صحبت میں حکمتِ عملی اور معاملاتِ (زندگی) کے بہت سے آداب سکھلائے)

ظاہری علوم کے حصول کے زمانے میں آپؒ کے ذہنِ رسا میں ہر علم و فن کے کئی قیمتی اور اہم نکات پیدا ہوتے رہے، جس سے مزید غور و فکر کی کئی اور راہیں کھلتی چلی گئیں۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''علوم کے حصول کے درمیان ہر فن میں بلند ترین خیالات میرے دل میں آتے رہے اور اپنی کوشش سے میری نظر میں سب معاملات کا حل پیدا ہوتا چلا گیا''

۱۱۲۹ھ/1717ء میں ظاہری تعلیم مکمل ہوئی اور اس کے بعد تربیتِ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سلسلے میں آپؒ کے مشائخ میں سرِفہرست آپؒ کے والدِ گرامی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ ہیں، جن سے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ، قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ حاصل کیا۔ دوسرے شیخ حضرت شیخ ابوطاہر کردی مدنی ہیں، جن سے ان تمام سلاسلِ عالیہ کی اجازت آپؒ کو حاصل ہے۔

شاہ صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

''پندرہ برس کی عمر میں والد بزرگوار سے بیعت کر کے اشغالِ صوفیا، خصوصاً مشائخ نقشبندیہ کے اشغال میں مصروف ہو گیا اور ان کی توجہ اور تلقین سے بہرہ ور ہوتے ہوئے ان سے آدابِ طریقت کی تعلیم اور خرقۂ صوفیا حاصل کر کے اپنے روحانی سلسلے کو درست کر لیا۔''

اور پھر تمام ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد تقریباً سال ڈیڑھ سال انھوں نے اپنے والدِ گرامیؒ سے سلسلۂ تصوف و ارشاد سیکھا، جس میں نقشبندی، قادری، سہروردی اور چشتی، یعنی چاروں سلاسل کی تعلیم و تربیت حاصل کی اور روحانی مقامات طے کیے۔

اپنے والدِ گرامیؒ کی مسندِ درس پر

جب حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ سترہ سال کی عمر میں اُن کے جانشین بنے۔ خود شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ سال تک تمام علوم، شروحات کے مطالعے کے ساتھ بڑی دِقتِ نظر سے پڑھائے۔ ہر علم سے متعلق جتنی بھی کتابیں دستیاب تھیں، اُن کے مطالعے کے ساتھ محققانہ نقطہ نظر سے شاہ صاحبؒ نے تعلیم و تدریس کا سلسلہ بارہ سال تک جاری رکھا۔ اس دوران ہر علم پر غور و فکر کر کے اُس کے بنیادی اصول، ضابطے اور قاعدے، اُن کی تلخیصات آپ کے ذہن میں آئیں۔ علم کا ہر شعبہ مرکزی علم کی شاخ ہے۔ اور پھر علوم کی مختلف شاخوں کے درمیان جو وحدت پائی جاتی تھی، اُن کو مربوط طور پر سمجھنے کا امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو موقع ملا۔

بارہ سال کی اس تحقیق اور تدریس کے نتیجے میں شاہ صاحبؒ کے دل میں علم کا ایک بہت بڑا وسیع سمندر سما گیا۔ چناں چہ انھوں نے اُسی زمانے میں علوم کی تلخیصات اور علوم کی تہذیب و تدوین شروع کر دی۔ ترجمہ قرآن حکیم

اسی بارہ سالہ دور کے اختتام تقریباً دس سال کی تدریس کے بعد (۱۱۴۰ھ/1728ء) شروع ہو جاتا ہے۔ اُسی وقت شاہ صاحبؒ نے غالباً سب سے پہلی کتاب ''المقدمہ فی قوانین الترجمہ'' لکھنا شروع کی۔ شاہ صاحبؒ نے ترجمہ نگاری کے مختلف اسالیب کا جائزہ لے کر، نیز مختلف تراجم ہائے قرآن حکیم کا جائزہ لے کر آپؒ نے ترجمہ نگاری کے اصول وقوانین مرتب کرنا شروع کیے۔ سورتِ بقرہ اور آلِ عمران پر مشتمل ''زہراوین'' کے عنوان سے ایک تفسیر بھی اُسی زمانے میں لکھی۔

پھر علوم کی طلب شاہ صاحبؒ کو حرمین شریفین لے گئی۔ بارہ سال کی اس تحقیقی تدریس وتعلیم کے بعد امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تقریباً دو سال (۸/ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ/ 21/ اکتوبر 1730ء تا ۱۴/ رجب ۱۱۴۵ھ/ یکم/ جنوری 1733ء) تک حرمین شریفین میں قیام پذیر رہے۔ خانۂ کعبہ کے فیوض وبرکات حاصل کیے۔ دو دفعہ حج کیا اور درمیان میں مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے فیوضات وبرکات حاصل کیے۔

حرمین شریفین کے اس قیام میں حضرت شاہ صاحبؒ کے جو دوسرے عظیم ترین شیخ یا استاذ، شیخ ابو طاہر کردی مدنی، اور دیگر مشائخ حرمین ہیں، ان سے علوم الحدیث اور دیگر علوم کی اجازت حاصل کی۔ اُن کے فیوضات وبرکات حاصل کیے۔ اور حرمین شریفین کی برکت سے مستقبل کے تمام امور کا ایک مربوط اور مکمل خاکہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ذہن میں آ گیا۔ جس کا اظہار شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''فیوض الحرمین'' میں کیا ہے کہ حرمین شریفین کے فیوض و برکات کے نتیجے میں کون کون سے علوم مجھ پر آئے۔ بعد کی زندگی میں حرمین سے واپس آ کر تقریباً تیس سال تک شاہ صاحبؒ نے یہاں دہلی اور گرد ونواح میں اپنے فیوضات وبرکات پھیلائے اور کتابیں لکھیں۔ اس وقت دستیاب کتابیں کوئی پچاس ساٹھ کے قریب ہیں۔ اُن کتابوں میں جتنی بھی علمی اور فکری بحث امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی ہے، ان کے اجمالی اشارے اور ان علوم کے اکثر بنیادی نکات ''فیوض الحرمین'' میں موجود ہیں۔ گویا کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اگلے دور کی تجدید کا اجمالی خاکہ حرمین شریفین میں ہی مرتب کر لیا تھا۔

شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ "الکعبۃ الحسناء" یعنی بیت اللہ کے فیوض وبرکات نے علم کا دروازہ کھول دیا، انھیں علوم پر پوری طرح شرحِ صدر ہو گیا، ان کا سینہ علوم کے لیے کھل گیا اور نبی اکرم ﷺ کے فیوضات وبرکات سے علومِ نبوت کا فیضان فوجاً فوجاً (تسلسل کے ساتھ) اُن کے قلب اور دل ودماغ پر نازل ہونے لگا۔ یہ تمام علوم سمیٹ کر یکم/ جنوری 1733ء کو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہندوستان واپس دہلی تشریف لاتے ہیں۔ اس کے بعد 1733ء سے لے کر 1762ء تک تقریباً تیس سال آپؒ کا مرکزِ علم وفکر دہلی رہا ہے۔ اس دوران آخری چار سال نادر شاہ کے حملے کے سبب امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ دہلی سے ہجرت فرما کر اپنے آبائی وطن پھلت تشریف لے گئے تھے۔ چار سال تقریباً حضرت کا وہاں قیام رہا۔ انتقال سے صرف چار یا پانچ مہینے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ دہلی تشریف لائے اور ۳۰/ محرم ۱۱۷۶ھ/ 21/ اگست 1762ء کو آپؒ کا انتقال ہو گیا۔ یہ شاہ صاحبؒ کی سیرت کے حوالے سے ایک مختصر خاکہ ہے۔

اسی بارہ سالہ دور کے اختتام تقریباً دس سال کی تدریس کے بعد (۱۱۴۰ھ/1728ء) شروع ہو جاتا ہے۔ اُسی وقت شاہ صاحبؒ نے غالباً سب سے پہلی کتاب ''المقدمہ فی قوانین الترجمہ'' لکھنا شروع کی۔ شاہ صاحبؒ نے ترجمہ نگاری کے مختلف اسالیب کا جائزہ لے کر، نیز مختلف تراجم ہائے قرآن حکیم کا جائزہ لے کر آپؒ نے ترجمہ نگاری کے اصول و قوانین مرتب کرنا شروع کیے۔ سورتِ بقرہ اور آلِ عمران پر مشتمل ''زہراوین'' کے عنوان سے ایک تفسیر بھی اُسی زمانے میں لکھی۔

پھر علوم کی طلب شاہ صاحبؒ کو حرمین شریفین لے گئی۔ بارہ سال کی اس تحقیقی تدریس و تعلیم کے بعد امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تقریباً دو سال (۸/ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ/ 21/اکتوبر 1730ء تا ۱۴/رجب ۱۱۴۵ھ/ یکم/جنوری 1733ء) تک حرمین شریفین میں قیام پذیر رہے۔ خانۂ کعبہ کے فیوض و برکات حاصل کیے۔ دو دفعہ حج کیا اور درمیان میں مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے فیوضات و برکات حاصل کیے۔

حرمین شریفین کے اس قیام میں حضرت شاہ صاحبؒ کے جو دوسرے عظیم ترین شیخ یا استاذ، شیخ ابوطاہر کردی مدنی، اور دیگر مشائخ حرمین ہیں، ان سے علوم الحدیث اور دیگر علوم کی اجازت حاصل کی۔ اُن کے فیوضات و برکات حاصل کیے۔ اور حرمین شریفین کی برکت سے مستقبل کے تمام امور کا ایک مربوط اور مکمل خاکہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ذہن میں آ گیا۔ جس کا اظہار شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''فیوض الحرمین'' میں کیا ہے کہ حرمین شریفین کے فیوض و برکات کے نتیجے میں کون کون سے علوم مجھ پر آئے۔ بعد کی زندگی میں حرمین سے واپس آ کر تقریباً تیس سال تک شاہ صاحبؒ نے یہاں دہلی اور گرد و نواح میں اپنے فیوضات و برکات پھیلائے اور کتابیں لکھیں۔ اس وقت دستیاب کتابیں کوئی پچاس ساٹھ کے قریب ہیں۔ اُن کتابوں میں جتنی بھی علمی اور فکری بحث امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی ہے، ان کے اجمالی اشارے اور ان علوم کے اکثر بنیادی نکات ''فیوض الحرمین'' میں موجود ہیں۔ گویا کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اگلے دور کی تجدید کا اجمالی خاکہ حرمین شریفین میں ہی مرتب کر لیا تھا۔

شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ''الکعبۃ الحسناء'' یعنی بیت اللہ کے فیوض و برکات نے علم کا دروازہ کھول دیا، انھیں علوم پر پوری طرح شرح صدر ہو گیا، ان کا سینہ علوم کے لیے کھل گیا اور نبی اکرم ﷺ کے فیوضات و برکات سے علومِ نبوت کا فیضان فوجاً فوجاً (تسلسل کے ساتھ) اُن کے قلب اور دل و دماغ پر نازل ہونے لگا۔ یہ تمام علوم سمیٹ کر یکم/جنوری 1733ء کو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہندوستان واپس دہلی تشریف لاتے ہیں۔ اس کے بعد 1733ء سے لے کر 1762ء تک تقریباً تیس سال آپؒ کا مرکزِ علم و فکر دہلی رہا ہے۔ اس دوران آخری چار سال نادر شاہ کے حملے کے سبب امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ دہلی سے ہجرت فرما کر اپنے آبائی وطن پھلت تشریف لے گئے تھے۔ چار سال تقریباً حضرت کا وہاں قیام رہا۔ انتقال سے صرف چار یا پانچ مہینے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ دہلی تشریف لائے اور ۳۰/محرم ۱۱۷۶ھ/ 21/اگست 1762ء کو آپؒ کا انتقال ہو گیا۔ یہ شاہ صاحبؒ کی سیرت کے حوالے سے ایک مختصر خاکہ ہے۔

شاہ صاحبؒ کے دور کے سیاسی، معاشی اور فکری حالات

اس دوران ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور فکری حالت، دیگر معاصر تذکروں اور خود شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریرات سے جو واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس دور کی سوسائٹی علمی اور فکری انتشار سے دوچار تھی۔ فکری اضمحلال اور انتشار سوسائٹی میں موجود تھا۔ سیاسی عدمِ استحکام تھا۔ معاشی بدحالی اور طبقاتی نظام قائم تھا۔

کسی سماج کی تشکیل میں یہی تین بنیادی چیزیں ہوتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے کا تجزیہ کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں علمی، فکری اور اس کے فلسفہ وفکر کی حالت کیا ہے؟ سوسائٹی میں وحدتِ فکری ہے یا انتشار ہے؟ سوسائٹی تبھی ترقی کرتی ہے کہ جب تمام لوگ ایک فکر پر متحد ہوں، ذہنی طور پر وہ بنیادی اساسی اصولوں پر متفق ہوں کہ پورے معاشرے کو نئے خطوط پر آگے بڑھانا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس طے شدہ فکر کی اساس پر ایک مربوط اور مستحکم سیاسی نظام جو امن وامان کو یقینی بنائے اور ہر انسان کی جان، مال اور عزت وآبرو کا تحفظ کرے۔ ایسا ہونا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اگر بدامنی اور خوف کی حالت ہو تو معاشرے ترقی نہیں کرتے۔

تیسرے یہ کہ سوسائٹی کا معاشی نظام وہاں کے بسنے والے تمام انسانوں کی احتیاجات کی تسکین کا، عدل و انصاف پر مبنی نظام قائم ہو کہ سوسائٹی میں معاشی خوش حالی ہوگی تو ترقی کرے گی، ورنہ بھوک وافلاس کی حالت میں معاشرے ناکام ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم میں مثالی معاشرے کی سیاسی اور معاشی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت آمنۃ مطمئنۃ یأتیھا رزقھا رغدا من کل مکان فکفرت بانعم اللہ فاذاقھا اللہ لباس الجوع و الخوف بما کانوا یصنعون.

(اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے کہ جو امن والی تھی اور ایسی مطمئن تھی کہ اس کا رزق وافر مقدار میں ہر طرف سے آ رہا تھا۔ انھوں نے اللہ کے نعمتوں کی ناشکری کی تو ان کی بداعمالیوں کے سبب اللہ نے انھیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مثالی سوسائٹی وہ ہے، جو امن والی ہو۔ مستحکم سیاسی نظام اور مضبوط حکومت کے سبب ہی سوسائٹی میں امن وامان قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح مثالی معاشرے کی دوسری خصوصیت قرآن نے یہ بیان کی کہ وہ ایسا مطمئن معاشرہ ہو کہ اس کا رزق وافر مقدار میں اسے مہیا ہو، یعنی معاشی خوش حالی ہو کہ ہر فرد کی معاشی احتیاجات کی تسکین ہو۔

سماجی زندگی کے ان بنیادی اساسی اصولوں کی روشنی میں معاصر مؤرخین اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریرات یہی بتلاتی ہیں کہ اس زمانے کا ہندوستانی معاشرہ علمی اور فکری حوالے سے انتشارِ فکر سے دوچار تھا، سیاسی عدمِ استحکام تھا اور معاشی ناانصافی تھی۔

علمی اور فکری انتشار کی حالت

یہ بات بڑی واضح ہے کہ سوسائٹی اسی وقت ترقی کرتی ہے کہ جب اس میں سوسائٹی کے سلگتے ہوئے مسائل کے حل کے لیے ایک مربوط قانونی اور فقہی نظام موجود ہو اور دوسرے یہ کہ ایسا قانونی نظام ایک جاندار اور مربوط فلسفہ وفکر پر استوار ہو۔ معاشرے ان دونوں کی ہم آہنگی کی اساس پر ترقی کرتے ہیں۔

اس وقت کے ہندوستانی معاشرے کے فکری انتشار کی حالت کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف فلسفے کے حوالے سے تین مکتبہ ہائے فکر منتشر افکار وخیالات پیش کر رہے تھے۔ جب کہ دوسری طرف فقہی اور قانونی نظام کے حوالے سے مختلف اور منتشر ذیلی فقہی جزئیات اور تخریجات اختیار کر کے فقہی انتشار پیدا کیا ہوا تھا۔

فلسفے کے حوالے سے ہندوستان کا یہ معاشرہ فلسفۂ یونان کے زیرِ اثر تھا۔ اہلِ علم جانتے ہیں اس فلسفے کے ماننے والے مشائین، یعنی مادیت پرستوں کے کچھ عقلی مزعومہ تخیلات معاشرے میں پھیل چکے تھے۔ فلسفے کا دوسرا سکول اشراقیین کا تھا، جو سوسائٹی میں اشراقی اور کشفی نقطہ نظر سے مسخ شدہ تصورات کا شکار تھا۔ انھیں کے زیرِ اثر رہبان، مجذوب، غیر علمی افراد، جو سوسائٹی میں جمود اور تنگ نظری پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں، موجود تھے۔ اس طرح جہاں فلسفۂ یونان کے ماننے والے مشائین مادی فلسفے کی اساس پر ایک دوسرے سے دست بہ گریبان تھے۔ اسی طرح اشراقیین کے زیرِ اثر تصوف کے نام پر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی انتہا پسندانہ تشریحات نے ایک انتشارِ فکر پیدا کیا ہوا تھا۔ یوں انتہا پسند طبقات لڑ رہے تھے۔

فلسفے کے یہ دونوں سکول، خواہ وہ تصوف کے عنوان سے ہوں یا مادیت یا پرستی یا عقل پرستی کی بنیاد پر ہوں، دونوں کے افکار وخیالات نے انتشار کی حالت پیدا کر رکھی تھی۔ ان کی حالت بہ قول شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے، قدیم یونانیوں کی بیان کردہ عقلیات سے رَس نکالنے کی لایعنی مشق کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں:

"فلسفہ یونان کی اتباع کرنے والوں کی حالت... کتا بھی پُرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتا، لیکن یہ ایسے ناقص لوگ ہیں کہ دو ہزار سال پُرانی ہڈیوں کو سونگھتے ہیں اور چاٹتے ہیں۔"

یہی حال جاہل صوفیا کا تھا۔ ایسے جاہل صوفیا علم فروشی کا کردار ادا کر رہے تھے۔ روحانیت کے نام پر لوگوں کو انھوں نے بے وقوف بنایا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"انّ هؤلآء المتصوّفة الضّالّة المُضلّة فى زماننا هذا أشهد لِلّٰه باللّٰه و عليهم أنّهم فرقة

نابتة في الإسلام ليست من أصل الإسلام."

(ہمارے اس زمانے کے یہ خود ساختہ حاملین تصوف خود بھی گمراہ ہیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ میں ان پر اللہ کی قسم اٹھا کر اللہ کے لیے گواہی دیتا ہوں کہ یہ اسلام میں ایک ایسا نیا پیدا شدہ فرقہ ہے کہ جس کی دین اسلام میں کوئی اصل نہیں۔)

دوسرے یہ کہ انسانی معاشرہ ترقی کرتا ہے قانون اور اصولِ قانون کی تعلیم وتربیت سے، جسے اُس زمانے میں فقہ اور اصولِ فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فقہی اور قانونی تعلیم کے لیے درسِ نظامی پر مبنی تعلیمی نظام ملا نظام الدین سہالوی (1748ء) نے فرنگی محل لکھنؤ میں (1693ء) قائم کیا تھا۔ ان کے پیش نظر تو اس مسلم ریاست کے قانونی اور عدالتی نظام کے لیے رجالِ کار تیار کرنا تھا، لیکن شاہ صاحبؒ کے زمانے میں اس درسِ نظامی کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ وہ فقہی یا قانونی موشگافیوں اور حیلہ جوئیوں میں اُلجھ کر رہ گئے، جس کو شاہ صاحبؒ "استخراجی فقہ" کہتے ہیں، وہ محض فتویٰ بازی، جمود اور تنگ نظری کا علم بن کر رہ گیا، حنفی شافعی اختلاف تو اپنی جگہ پر تھے ہی، لیکن خود حنفیوں میں بھی مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے الفاظ میں کچھ "ورّاقین"، یعنی ورق گردانی پر اکتفاء کرنے والوں نے انتشارِ فکر پیدا کیا ہوا تھا۔ اس سے دینی قانون اور علم وفکر کی یک جہتی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ علم بھی ایک رسم بن کر رہ گیا تھا اور اس کا مقصد سوائے حکومت کا آلہ کار رہنے کے، خواہ حکومت کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ کردار ادا کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے "التّفهيمات الإلٰهيه" میں لکھا ہے کہ:

"أيها السُّفهاء المسمّون أنفسكم بالعلماء، اشتغلتم بعلوم اليونانيين، وبالصّرف، و النّحو، و المعاني، و ظننتم أنّ هذا هوا العلم. إنّما العلم آية محكمة من كتاب الله أن تتعلّموها .. أو سنّة قائمة من رسول الله صلّى الله عليه و سلّم .. أو فريضة عادلة أن تتعلّموا."

(اے ایسے بے وقوف اور نادان لوگو! کہ جنھوں نے اپنا نام "علما" رکھ لیا ہے۔ تم یونانی علوم، صرف ونحو (عربی کی گرائمر) اور علم معانی (فصاحت وبلاغت کے علم) میں مشغول ہو، اور سمجھتے ہو کہ بس یہی علم ہے۔ حقیقت میں علم، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی محکم آیات کا نام ہے... یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ سنت کا نام ہے... یا عدل و انصاف کے قائم کرنے کے فریضے کا نام ہے۔ تم اس کی تعلیم حاصل کرو۔)

شاہ صاحبؒ کے مطابق علما تو موجود ہیں، لیکن وہ علم کو غلبہ دین کے مقاصد کیلئے یا شعائرِ دین کے غلبے کیلئے استعمال کرنے کے بجائے محض علم فروشی کا کام کرتے ہیں۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے "التّفهيمات الإلٰهيه" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"أما ترون البلاد العظام تخلوا عن العلماء، و إن كانوا فهم دون ظهور الشّعائر."

(کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ علاقوں کے علاقے علما سے خالی ہو گئے ہیں اور اگر کہیں علما ہیں بھی تو وہ دینی شعائر

کے غلبے کی جدوجہد سے دور رہتے ہیں۔)

آپ دیکھیئے کہ شاہ صاحبؒ نے یہ علمی اور فکری جائزہ لے کر فکری انتشار کے ذمہ دار جو مختلف مکاتبِ ہائے فکر ہیں، ان پر کڑی تنقید خود بھی کی اور اس زمانے کے تمام مؤرخین بھی اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ "البدور البازغہ" کا پورا مقدمہ فلاسفہ یونان کے غلط مزعومات کی تردید میں ہے۔ اسی طریقے سے حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمے میں علما کے کم علمی پر بنی جو مختلف تصورات ہیں، ان پر گفتگو ہے۔ "التّفهيمات الإلٰهيه" کی جلد اوّل تفہیم نمبر 69 میں شاہ صاحبؒ نے پوری تفصیل کے ساتھ علما، صوفیا، مشائخ، فوجیوں، حکمرانوں، امرا، تجار، صنعت کار، مزدوروں اور کسانوں کو خطاب کر کے اُن کی کمزوریاں واضح کی ہیں۔ اور بتلایا ہے کہ کون کون سی خامیاں ان لوگوں کے اندر پیدا ہو چکی ہیں۔

سیاسی عدمِ استحکام کی حالت

ایک طرف تو فکری اور دینی بحران کی حالت ہے۔ کتاب و سنت ایک طرف رہ گیا اور استخراجی فقہ اور اس کی اصولی مباحث میں پچھلے ہزار سال کی حیلہ جوئیوں کے استعمالات سے اس کی قانونی روح ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ فقہی قوانین جس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے، وہ ختم ہو کر رہ گیا۔ شاہ صاحبؒ نے اس کی ہی نشان دہی کی۔

شاہ صاحبؒ کے زمانے میں ایک تو یہ فکری انتشار موجود تھا۔ دوسرے سیاسی عدمِ استحکام تھا۔ اس دور میں ہندوستان کی سیاسی حالت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ خود شاہ صاحبؒ کے اس ساٹھ سالہ دورانیے میں کوئی دس سے زیادہ حکمران یکے بعد دیگرے بدل چکے تھے۔ جب کہ دنیا بھر میں جہاں بھی مستحکم حکومتیں قائم ہوتی ہیں، اُن کی پالیسیوں میں ایک تسلسل ہوتا ہے۔ اس پالیسی تسلسل کے تحت وہ فیصلہ سازی کرتی ہیں اور ملک ترقی کرتا ہے۔ پچاس سال اورنگزیب عالمگیر کی حکمرانی اور اس سے پہلے شاہ جہان، جہانگیر اور اکبر کی حکمرانی کا بھی تقریباً چالیس چالیس پچاس پچاس سال کا دورانیہ ہے۔ اس طرح ایک سیاسی نظام مسلسل رہا، لیکن شاہ صاحبؒ کے پچاس سال کے دورانیے میں دس حکمران رہے۔

سیاسی نظام کی خرابی کا اندازہ اس طرح لگائیے کہ حکمران طبقات ذاتی عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر قومی و اجتماعی معاملات میں قوت فیصلہ جیسی اہم طاقت سے محروم ہو گئے تھے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ (حکمران) صبح کو ایک مشورہ طے کرتے ہیں اور شام کو اسے توڑ دیتے ہیں۔"

اس دور کے سیاسی حکمرانوں کی قوتِ فیصلہ نہ ہونے اور اس سیاسی کمزوری کا نتیجہ شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں یہ نکلا کہ:

"نام کے سوا حکومت و سلطنت کا اور کچھ باقی نہیں رہا"

غرض کہ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں ہندوستانی سماج، سیاسی طور پر تباہ و برباد ہو چکا تھا، اور شاہ صاحبؒ کو

بڑی دل گرفتگی کے ساتھ یہ کہنا پڑا:

''دہلی کی حکومت اور سلطنت بچوں کا کھیل بن کر رہ گئی ہے''

سیاسی عدمِ استحکام کے نتیجے میں بدامنی اور خوف پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہی زمانہ ہے جس میں مختلف حملے دہلی پر ہوتے ہیں جیسے نادر شاہ کا حملہ ہے۔ داخلی اختلاف وانتشار کی حالت میں قتل وغارت گری ہورہی ہے۔ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی فساد انگیز طاقت ہے۔ مرکزی حکومت کا کمزور ہوجانا ہے۔ شاہ صاحبؒ اپنے ایک خط میں سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دیکھو پورے ہندوستان کے تمام صوبوں کا ریونیو(revenue) کم ہوگیا ہے۔ مرکزی حکومت کے پاس وسائل نہیں ہیں اور ان وسائل نہ ہونے کی وجہ سے مستحکم نظام قائم کرنے سے عاجز ہے۔

اقتصادی دیوالیہ پن اور معاشی عدمِ استحکام کی حالت

اپنے دور کے اقتصادی دیوالیہ پن اور معاشی عدمِ استحکام کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے شاہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں:

لوگوں نے قومی خزانے کو مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعے لوٹنا شروع کردیا ہے، اور اس ذاتی مفاد پرستی پر مبنی لوٹ کھسوٹ کو ہی اپنی کمائی کا دھندہ بنالیا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو غازی اور مجاہد بن کر اسے لوٹ رہے ہیں۔ بعض علما ہیں جو اپنے تئیں علم کی وجہ سے قومی خزانے کا مستحق سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو حکمران طبقات سے بخشش اور انعام واکرام کے طلب گار رہتے ہیں، جیسے نام نہاد صوفی، شاعر اور ادیب لوگ ہیں۔ اور باقی لوگ بھی لوٹ کھسوٹ کے مختلف حیلوں بہانوں سے قومی خزانے کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ ان میں ذاتی مفادات اتنے غالب آچکے ہیں کہ انھوں نے اسی لوٹ کھسوٹ کو اپنی کمائی کا پیشہ بنایا ہوا ہے۔ اور وہ اسے قومی اور اجتماعی مصلحتوں سے قطع نظر بہت اچھا کام سمجھتے ہیں۔ ذاتی مفاد پرستی کا عالم یہ ہوگیا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور پھر وہ ایک دوسرے کے لیے تنگی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ تمام لوگ سوسائٹی اور ملک پر بوجھ بن چکے ہیں۔

شاہ صاحب نے واضح کیا کہ بیت المال پر تمام لوگوں کا جھپٹنا، اس کے وسائل کو لوٹنا اور اس لوٹ کھسوٹ میں تمام تر افراد کا شامل ہونا معاشی عدمِ استحکام کا سبب بن گیا۔ شاہ صاحبؒ نے لکھا کہ جو فوجی اور اُمرا ہیں، وہ اس لیے کہ ہم نے ملک کی خدمت سرانجام دی ہے، ہمیں زیادہ سے زیادہ پیسے ملنے چاہئیں۔ علما ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم علم دے رہے ہیں، اس لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ بیت المال سے پیسے ملنے چاہئیں۔ شعرا اور اُدبا ہیں، وہ اس بیت المال پر جھپٹنا چاہتے ہیں کہ ان کی نظریں اس پر ہیں۔ وعظ گو ہیں تو وہ اپنے وعظ کا وظیفہ بھی خلیفہ اور حکومت سے لینا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اور تو اَور وہ فقرا اور زہاد یا صوفیا جو زہد وتقویٰ کی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کا معاوضہ ہمیں

حکومت سے ملے۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ عجیب بات ہے کہ بیت المال ہے، جو قومی نظام چلانے کے لیے، ملکی نظم و نسق کی عمومی اسلامی مصلحت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے یا یہ کہ یہ اُجاڑنے کی جگہ ہے کہ ہر آدمی اُس پر بوجھ ہے؟

شاہ صاحبؒ نے آخر میں ایک جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ: ''یہ سب کے سب اس سوسائٹی پر بوجھ بن چکے ہیں۔'' اور پھر اس چھینا جھپٹی میں ہر ہر طبقے کا جہاں داؤ لگتا ہے تو وہ اس داؤ کے نتیجے میں آپس میں لڑتے ہیں، ایک دوسرے پر فتوے لگاتے ہیں، کافر بناتے ہیں، مال و دولت کی لڑائی جھگڑے کے سبب ایک دوسرے کی عزتیں اُچھالتے ہیں، یہاں تک کہ سارے ہی لوگ حکومت کے سامنے دریوزہ گر اور بھیک مانگنے والے بن گئے۔ ایک جملہ حضرتؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک عمدہ ترین بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے حکومت سے مال لوٹا جائے۔ ملک کی اصلاح اور سوسائٹی کی ترقی کا نظام قائم کرنا ان کا مقصد اور ہدف نہیں ہے۔ یہی تکسّب ہے، یہی ان کا پیشہ ہے۔

اس طرح اس زمانے میں دو طبقات پیدا ہوگئے۔ یوں طبقاتی نظام وجود میں آ گیا۔ جن کا ہاتھ پڑتا ہے اور طاقت ور ہیں وہ تو اس بیت المال یا حکومت کے خزانے یا قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر سب سے آگے ہیں اور اس طرح امیر سے امیر تر بنتے جا رہے ہیں۔ جس بے چارے کا ہاتھ نہیں پڑتا، وہ غریب اور غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا۔

شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس طبقاتی نظام میں دونوں طبقے دو مختلف حالتوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک طبقہ قیصر روم اور کسریٰ فارس کی طرح عیاشیوں کے سبب بے راہ روی کا شکار تھا۔ شاہ صاحبؒ قیصر و کسریٰ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''و ما تراه من ملوك بلادك يغنيك عن حكاياتهم، فدخل كلّ ذٰلك في أصول معاشهم، و صار لا يخرج من قلوبهم إلاَّ أن تمزّع و تولّد من ذالك داء عضال، دخل في جميع أعضاء المدينة.''

(عصر حاضر کے ملوک وسلاطین اور والیانِ ریاست کی عیاشیوں کو دیکھ کر تم ان (قیصر و کسریٰ) کی عیاشیوں اور زندگی کی لذات میں حد سے بڑھنے کا اندازہ لگا سکتے ہو، سرمایہ پرستی کے یہ تمام امراض ان کے اصولِ معاشیات میں داخل ہو چکے تھے۔ لوٹ کھسوٹ کا یہ طریقہ ان کے رَگ وپے میں سرایت کر چکا تھا۔ جس کی وَجہ سے پورے تمدن اور معاشرے میں موجود تمام جماعتوں میں ایک لاعلاج رَوگ پیدا ہو گیا تھا۔)

اس طرح شاہ صاحبؒ نے واضح کیا کہ آج کے زمانے کے ان حکمرانوں کو تم دیکھو تو قیصر و کسریٰ کو تم بھول جاؤ۔ وہی حالت ان لوگوں کی ہے۔ ان میں سے ایک ایک امیر آدمی ایک پٹکا بھی باندھتا ہے تو وہ بھی کئی کئی لاکھ روپے کا ہے۔ اور اگر کسی عیاشی کی مجلس میں جاتے ہیں تو وہاں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں کہ میرے پاس کتنا قیمتی جبہ ہے، میرے پاس کتنا قیمتی پٹکا ہے، کتنی قیمتی بڑی کلاہ (ٹوپی) لگا رکھی ہے۔ اس پر مقابلے ہوتے ہیں، مناظرے ہوتے ہیں۔ اور پھر اس پر جھگڑتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ کسی قوم میں اگر سبھی لوگ وسائل کو لوٹنے لگ جائیں تو اتنے وسائل کہاں سے آئیں گے؟ اس کے نتیجے میں ایک دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ جو کاشت کار، صنعت کار یا تاجر ہیں، تو ان کام کرنے والوں پر ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے بیان کیا کہ اصولِ مکاسب (بنیادی پیشے)؛ زراعت، تجارت اور صنعت ہیں۔ یہ تین ہی شعبے شاہ صاحبؒ نے بیان کیے ہیں (شاہ صاحبؒ کے نظریہ معیشت کے حوالے سے جب ہمارا موضوع آئے گا، ہم اس پر تفصیلی گفتگو کریں گے) معاشیات کے ان تین بنیادی شعبوں میں کام کرنے والے جب یہ ظالمانہ ٹیکس ادا نہیں کر سکتے تو وہ مجبور ہو کر دو راستے اپناتے ہیں: یا تو وہ ردِّ عمل میں تشدد پسند بنتے ہیں۔ پھر حکمران طبقہ اُن کے قتل کے درپے ہوتا ہے۔ یا مجبوراً وہ ٹیکس دیتے ہیں تو اُن کی کارکردگی پر فرق پڑتا ہے اور وہ غریب سے غریب تر بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح قومی ریونیو (revenue) مسلسل گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی کتابوں میں کئی مقامات پر اس کا واضح نقشہ کھینچا ہے۔ ایک جگہ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''عیاشانہ زندگی بسر کرنے کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی، اس کا حصول بہت سی دولت خرچ کیے بغیر ناممکن تھا۔ اس لیے ان ملوک وسلاطین نے محنت کش طبقات یعنی کسانوں اور تاجروں وغیرہ پر بھاری ٹیکس لگا دیے۔ اگر وہ ٹیکس دینے سے انکار کرتے تو ان کو مارا پیٹا جاتا اور سخت عذاب دیا جاتا۔ اس طرح ان کے سامنے دوسرا راستہ ہی رہ گیا کہ وہ سلاطین اور سرمایہ داروں کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں۔ بیلوں اور گدھوں کی سی ذلیل زندگی بسر کریں۔ جن سے ان کی مرضی کے بغیر ہل چلانے، زمین کی کاشت، پیداوار اٹھانے اور کنویں سے پانی نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جن کی تھوڑی بہت پرورش یا غور و پرداخت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ مالکوں کی اپنے اغراض ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں''

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ جو عیاش طبقہ مال و دولت اکٹھا کرتا ہے اور امیر سے امیر تر ہونے کی حالت میں ہوتا ہے، وہ دین سے دور ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ دین کی تعلیمات پر عمل کرے گا تو اسے ساری لوٹ کھسوٹ، جھوٹ اور بددیانتی کا ارتکاب چھوڑنا پڑے گا۔ اُن کی عیاشیوں میں فرق آئے گا۔ اس طرح وہ دینِ حق کا انکار کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے ہی جاری کردہ طریقۂ کار کو اصل سمجھتا ہے اور اُسی کو دین کے نام سے مسلط کرتا ہے۔ اب جس عالم نے لوٹ کھسوٹ کرنی ہے، جس شاعر اور ادیب نے یہ کام کرنا ہے، جس حاکم وقت یا فوجی حکمران نے یہ ظلم وستم کام کرنا ہے، وہ بھلا دین کے اساسی اصولوں اور اس کی اَخلاقیات پر عمل کیوں کر کرے گا؟

شاہ صاحب عیاش حکمران طبقوں کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''یہ مقتدر طبقات وسرمایہ پرست لوگ دنیا کی لذتوں میں ڈوب گئے اور آخرت کو بھول گئے۔ شیطان نے ان پر اپنا تسلط جما لیا۔ یہ لوگ اپنی دنیوی زندگی کی عیاشیوں میں غرق ہو گئے۔ اور اس پر فخر کرنے لگے''

اسی طریقے سے شاہ صاحبؒ نے اُن لوگوں کی مثال دی ہے کہ جو جانوروں کی سطح پر رہ کر، گدھوں اور بیلوں

کی طرح کام کرنے میں جُتے رہتے ہیں، ایسے مزدور، کاشت کار یا اُن پیشوں سے وابستہ لوگ جو سارا سارا دن کام کرنے کے باوجود بھی اُن کی معاشی حالت درست نہیں ہوتی، انھیں ٹیکس دینے کے لیے مجبوراً کام کرنا پڑتا ہے، تو وہ جانوروں جیسے ہونے کی وجہ سے سعادتِ اُخروی اور دینی اصولوں پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''پھر اُن کو محنت اور مشقت سے ایک گھڑی بھی آرام کا موقع نہیں دیا جاتا، یہاں تک کہ یہ لوگ سعادتِ اُخرویہ کی طرف بالکل توجہ نہیں دے پاتے اور نہ ہی یہ اس قابل رہتے ہیں''

شاہ صاحبؒ نے عملی بات کی کہ جب کسی مزدور کے سامنے آپ بات کریں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، عبادات کرو، آخرت کا فکر کرو، لیکن چوبیس گھنٹے میں اس کے پاس وقت ہی موجود نہیں ہے کہ جس میں وہ یہ کام کر سکے۔ تو وہ کیسے عبادات کی طرف متوجہ ہوگا؟ ایسے صورتِ حال میں شاہ صاحبؒ نے کہا کہ یہ دونوں طبقے دین سے عاری ہو جاتے ہیں۔ ایک مجبوری سے اور دوسرا عیاشی کی وجہ سے دین سے دور ہو جاتا ہے۔

طبقاتی تقسیم کے اس ظالمانہ کردار کی وجہ سے معاشرے کا ہر فرد، دین سے دور ہو جاتا ہے، اور یوں پورا معاشرہ دین بیزاری کی لعنت میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ شاہ صاحب کے الفاظ میں:

''و رُبما كان إقليم واسع ليس فيهم أحد يهمُّه دينه.''

(بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بڑے ملک میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہوتا کہ جو اپنے دین کی فکر کرے۔)

معاشرے پر انسان دشمن طاقتوں کا تسلط

شاہ صاحبؒ نے ایک اَور حقیقت واضح کی کہ نہ صرف یہ کہ اُس سوسائٹی میں افتراق و انتشار اور مختلف فرقے اور گروہ بن گئے تھے، بلکہ اسی کے ساتھ مرہٹوں کی طاقت الگ اُبھر رہی ہے، جو سوسائٹی میں مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ اور انسانیت دشمنی کا کام کر رہی تھی۔ خود انسانیت کے علَم بردار مسلمان اگر اس لوٹ کھسوٹ میں شریک ہو گئے تو جو باقی مذاہب، جن میں انسانی اقدار کا کوئی تصور نہیں ہے، تو وہ تو لوٹ کھسوٹ میں ان سے بھی آگے بڑھیں گے۔ مرہٹوں کی ظالمانہ کارروائیاں تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں کہ انھوں نے خود ہندوؤں کی لوٹ کھسوٹ کے لیے بھی کیسا ظالمانہ کردار ادا کیا۔

اسی طرح شاہ صاحبؒ کی نظر ایک اَور پہلو پر بھی ہے۔ انھیں صاف طور پر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ایک طرف ملک کا سماجی نظام دگرگوں حالت میں ہے۔ اور دوسری طرف غیر ملکی سامراج، آہستہ آہستہ پورے ملک کو اپنے ظالمانہ شکنجے میں جکڑ رہا ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ مکہ مکرمہ سے لکھے گئے اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''احوالِ مردم ہند، بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشاءِ فقیر است، بلادِ عرب نیز دیدم، و احوالِ مردم ولایتِ افرنگ از ثقات ایں جا شنیدم۔''

(ہندوستان کا حال ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ فقیر (شاہ صاحبؒ) کا وطن ہے۔ عرب ممالک

کو بھی دیکھا ہے اور یورپ کے لوگوں کے حالات بھی، ثقہ آدمیوں سے اس جگہ (مکہ مکرمہ) سنے ہیں۔)

اس سے شاہ صاحبؒ کی دور بین نگاہ کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کے داخلی اور خارجی حالات پر آپؒ کی گہری نظر تھی۔

اس وقت انگریز اُبھرتی ہوئی طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنگال پر حملہ آور ہو رہی ہے، شاہ صاحبؒ کی نظر میں وہ بھی ہے۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ بنگال جیسا سرحدی صوبہ، جس کا ریونیو مغل ریاست میں بہت زیادہ تھا، اس پر ایک بے وقوف نوجوان سراج الدولہ، جس میں حکمرانی کی اہلیت نہیں ہے اس کو مقرر کر دیا ہے۔ وہ تو ان تمام سازشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''عہدِ محمد شاہ میں بنگال سے ہر سال ایک کروڑ کا ریونیو آتا تھا۔ اور وہاں کا صوبے دار ہمیشہ بروقت اسے بھیجتا رہتا تھا۔ اتنی رقم کی ادائیگی کے باوجود کہ بنگال کا صوبے دار ہندوستان کے امرا میں انتہائی مال دار امیر تھا۔ اس وقت بھی کہ بنگال میں اطمینانی ہے اور وہاں ایک بے وقوف ناواقف کار نوجوان یعنی قدیم ناظم کا پوتا مسلط ہے۔ وہ نوجوان بے شمار خزانوں کا مالک ہے''

شاہ صاحبؒ کی بات کو تاریخ نے ثابت کر دیا کہ 1757ء میں شاہ صاحبؒ کی زندگی میں ہی سراج الدولہ کو شکست ہوتی ہے اور بنگال انگریزوں جھولی میں جا گرتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں ہندوستان میں داخلی انتشار جس میں فکری، سیاسی اور معاشی حالت کی خرابی ہی کیا کم مصیبت تھی کہ باہر سے حملہ آور انگریزوں نے ہندوستان کا اہم ترین مالیاتی ترقی یافتہ صوبہ بھی چھین کر اپنے قبضے میں لے لیا۔ اور شاہ صاحبؒ کا جب 1762ء میں وصال ہوتا ہے تو بنگال، اُڑیسہ وغیرہ تین صوبوں کی دیوانی اور مالیاتی نظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس چلا جاتا ہے۔

شاہ صاحب کے اس ساٹھ سالہ عہد کا یہ وہ منظر نامہ ہے، ایسے حالات میں شاہ صاحبؒ نے اپنے فکر و عمل کو مرتب کیا۔ شاہ صاحبؒ کے فکر و عمل کی ترتیب میں، اس منظر نامے کا بڑا دخل ہے اس لیے اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

علمی تحقیق و تجدید کا ولی اللّٰہی منہج

کسی سوسائٹی میں فکری انتشار اور علمی اختلافات معاشرے کے سیاسی استحکام اور معاشی اضمحلال کا باعث بن رہے ہوں تو سب سے پہلی ضرورت علم و شعور کے محققانہ انداز و اُسلوب کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی سوسائٹی کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ جہاں سے فکر و عمل کے سرچشمے پھوٹ رہے ہیں، انھیں مہذب اور مرتب بنایا جائے۔ اہلِ علم کا نظریہ و فکر اور علم و شعور درست ہو۔ اس لیے سب سے پہلے شاہ صاحبؒ نے علمی طور پر دین کا ایک مستحکم علمی مربوط نظام مرتب کیا۔ انھوں نے بار[illegible]ال تک اسلامی علوم[illegible] تحقیق کے ساتھ تدریس کی تھی، حرمین شریفین کے علما سے علوم کا فیضان حاصل کیا تھا، خاص طور[illegible] منورہ[illegible] حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوضات و برکات سے

مستفیض ہوئے تھے۔ چناں چہ اس کی روشنی میں انھوں نے اپنا علمی منہج اور فکری اُسلوب متعین کیا۔

اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''علم تطبیق الآرا'' دریافت کیا اور اُسے تمام علوم و افکار اور اعمال و اَخلاق کی تفہیم کے لیے علمی اور فنی طور پر استعمال کیا۔ اس علم کی حقیقت و ماہیت یہ ہے کہ سب سے پہلے مختلف علوم و فنون اور اعمال و اَخلاق کے بنیادی حقائق اور امورِ واقعیہ کا تعین کیا جائے اور پھر اُس شعبۂ علم سے متعلق ''امرِ واقعی'' کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف علمی آرا کا تحقیق و تجزیہ کیا جائے۔ جو رائے ''امرِ واقعی'' کے عین مطابق یا اُس کے قریب تر ہو، اُسے قبول کیا جائے اور جو رائے اُس کے بالکل مخالف یا بعید تر ہو، اس کی اس حیثیت کا تعین کیا جائے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک علم کے تین ذرائع عقل، نقل اور کشف ہیں۔ انھیں تینوں ذرائع کو بروئے کار لاکر ہر شعبۂ علم سے متعلق ''امرِ واقعی'' کا تعین کیا جائے گا۔ اور پھر پیش آمدہ آرا کے اختلاف کو اسی تناظر میں حل کیا جائے گا۔ علم تطبیق الآرا کے حوالے سے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اے میرے بھائیو! اللہ تم پر رحم کرے۔ یہ بات جان لو کہ بے شک ہر زمانے اور ہر صدی کا ایک علم ہوتا ہے، جو اللہ عز و جل کی رحمت سے لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ...اللہ کی رحمت کی جو تقسیم اس دور میں ہے، اس میں ہمارا حصہ یہ ہے کہ اللہ نے اس اُمت کے علما کے تمام علوم، خواہ وہ معقول ہوں یا منقول اور مکشوف، ہمارے سینے میں جمع کردیے ہیں۔ ان (عقل، نقل اور کشف سے حاصل کردہ) علوم کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے اور اس کی روشنی میں ان تینوں ذرائع سے حاصل شدہ علوم کے درمیان اختلافات کے حل کا طریقہ بھی عنایت کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر ایک قول کو اپنے اصل مقام پر رکھ کر سمجھا گیا ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جو اللہ کی حمد و توفیق سے علم کے فنون؛ علمِ فقہ، علمِ کلام، علمِ تصوف وغیرہ میں جاری ہے''

شاہ صاحبؒ نے اس علم کی روشنی میں عقل، نقل اور کشف کے تناظر میں حکمتِ عملیہ کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر شعبۂ علم کے بنیادی حقائق اور واقعی امور کا تعین کیا اور پھر اُس کی روشنی میں ایک مربوط علمی اور فکری مؤقف اختیار کیا۔ شاہ صاحبؒ نے یہ اصول علوم القرآن، علومِ حدیث، علومِ فقہ، علومِ تصوف، علومِ تاریخ، علم فلسفہ، علم کلام وغیرہ سے متعلق اختلافِ فکر و عمل کو حل کرنے اور وحدتِ فکر و عمل پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔

شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں تمام علوم و فنون میں اس اصول کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ یہاں ہم اس کی ایک اہم ترین مثال دین اسلام پر عمل کی ایک شاہراہِ فکر و عمل متعین کرنے کے حوالے سے پیش کریں گے۔ شاہ صاحبؒ نے اس اصول کا استعمال کرتے ہوئے شریعتِ محمدیہ کے امورِ واقعہ کا تعین کرنے کے لیے ''**الجادة القویمه من الشّریعة المحمّدية**'' (محمدی شریعت کی ایک واضح شاہراہِ فکر و عمل) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کو شاہ صاحبؒ نے بار بار اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ کہیں مختصر ''**الجادة القویمه**'' لفظ استعمال کیا ہے اور کہیں اس سے 'من الشّریعة المحمّدیه'' یا ''المصطفویه'' وغیرہ وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ یہ اصطلاح

سب سے پہلے ان کی کتاب ''فیوض الحرمین'' میں نظر آتی ہے۔ پھر ''التفہیمات الالٰہیہ'' میں شاہ صاحبؒ نے اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

انسانی سماج کی تشکیل کے لیے فلسفہ علوم (علم اسرارِ دین) کا تعین

اس طرح شاہ صاحبؒ نے علمی اور فکری بنیادیں مضبوط بنائیں اور اس حوالے سے باقاعدہ علوم مرتب اور مدوّن کیے۔ محض نظریات وافکار بیان کر لینا کافی نہیں ہے۔ علمی طور پر اور سائنٹفک طور پر علوم کو مرتب اور مدوّن کر کے ان کے فہم کا صحیح طریقہ اور فلسفہ مرتب کرنا بھی بنیادی کام ہے جو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کیا ہے۔ چناں چہ شاہ صاحب کا دوسرا بنیادی کام یہ ہے کہ انھوں نے انسانی سماج کی درست تشکیل کے لیے ایک مکمل فلسفہ فکر مرتب کیا، جس کو انھوں نے ''علم اسرارِ دین'' کا عنوان دیا۔ جس کو آپ ''فلسفة التشريع الإسلامي'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے ایک مکمل فلسفہ فکر وعمل مرتب کیا، جس میں فکری، علمی، سیاسی اور معاشی اصول اور ضابطے واضح کیے۔ اور سماج کی تشکیل اور ارتقا کا پورا عمرانی ڈھانچہ بیان کیا، اس کو شاہ صاحبؒ نے ''ارتفاقات'' کا عنوان دیا ہے۔

علوم کی تدوین وترتیب کا بنیادی نظام

اب ہم ان دونوں پہلوؤں پر مرحلہ وار گفتگو کریں گے۔ ہمیں اگر علم کی اساس پر وحدتِ فکر پیدا کرنا ہے تو اس کے لیے ہمیں ایک واضح راستہ اختیار کرنا ہے۔ اس راستے کے بنیادی اساسی اصول ہیں۔

دیکھیے! منبع علم ذاتِ نبوت ہے۔ اور ذاتِ نبوت حضور اقدس ﷺ پر اللہ کا جو قانون اور ضابطہ آیا ہے، اس کے علمی طور پر ہمارے پاس پہنچنے کے چار بنیادی منابع ترتیب وار ہیں، جن کے ذریعے سے علوم نبوت اخذ کیے جائیں۔ اس کے علاوہ علم کا اگر دعویٰ کیا جائے تو وہ دین کا علم نہیں ہے، وہ کسی کی ذاتی اور شاذ رائے ہوسکتی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے دین اسلام کے جادۂ قویمہ کا تعین کرتے ہوئے سب سے پہلے کتابِ مقدس قرآن حکیم کی نصوص سے حاصل شدہ علم کو امرِ واقعی قرار دیا۔ اس کے بعد احادیث مستفیضہ صحیحہ یعنی صحیح اور مشہور احادیث کو قرار دیا۔ تیسرے درجے پر کبار صحابہؓ اور تابعینؒ کے مذہب کو قرار دیا۔ چوتھا درجہ اُن احادیثِ مبارکہ کا ہوگا جو فقہا کے نزدیک صحیح یا حسن ہے۔ ان چار امورِ واقعیہ سے ثابت شدہ دین شریعتِ محمدیہ کا ظاہر ہے۔

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''شریعتِ مطہرہ کا ایک ظاہر ہے اور ایک شاذ ہے۔ اور شریعتِ مصطفویہ کے ظاہر کے چند مراتب ہیں:

1. ان میں سب سے مضبوط قرآن حکیم کی ایسی نص ہے کہ کلام اسی معنی اور مطلب کے لیے لائی گئی ہو۔ اہل زبان کے لیے اُس کی مراد اور مفہوم مخفی نہ ہو۔
2. اس کے بعد وہ علم ہے جو صحیح اور مستفیض احادیث سے معلوم ہوا ہو۔

3۔ اس کے بعد ان کبار صحابہؓ اور تابعینؒ کا مذہب ہے، جسے امام مالکؒ نے موطا میں بیان کیا ہے اور اس پر اہل مدینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر امام مالکؒ کے زمانے تک عمل کرتے رہے۔ اور اسی کے حکم میں وہ ہے جسے (کوفہ میں) مثلاً امام سفیان ثوریؒ وغیرہ نے صحابہؓ کے علم کے طور پر روایت کیا ہے۔

4۔ اس کے بعد وہ علم ہے، جو کتبِ مشہورہ میں روایت شدہ صحیح یا حسن حدیث سے ثابت ہے۔ ایسی حدیث کہ جس کی بنیاد پر حجت قائم کی جاسکے۔ اس حدیث کو فقہا کی ایک جماعت نے لیا ہے۔ یا وہ علم ہے کہ جو صحیح اور مضبوط استنباط کے ذریعے سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور اس کے صحیح ہونے پر ایک جماعت گواہی دے۔

ان چار مراتب سے ثابت شدہ علم نبی اکرمؐ کی شریعت کا ظاہر ہے۔ یہی آپؐ سے ثابت شدہ طریقۂ کار کا جادۂ قویمہ ہے، جس کا ہدایت پر ہونا بالکل واضح ہے۔ اور اس کی قدر و عظمت کا ہونا ظاہر و باہر ہے۔''

شاہ صاحبؒ نے اس طریقے سے سمجھایا کہ علما جانتے ہیں کہ جب فقہ حنفی پر بحث کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ فقہ حنفی کی کچھ ظاہر الروایت ہے اور کچھ نادر الروایت ہے۔ فقہ شافعی کی یہ ظاہر الروایت ہے اور یہ نادر الروایت ہے۔ چناں چہ حنفیوں کی ظاہر الروایت میں کہا جاتا ہے کہ امام محمد بن حسنؒ کی چھ کتابیں (الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر، المبسوط اور الزیادات) ہیں، جو اصولِ ستہ کہلاتی ہیں۔ امام شافعیؒ کی ظاہر الروایت وہ اقوال ہیں، جس پر امام رافعیؒ اور امام نوویؒ متفق ہیں، وہ ظاہر الروایت کہلائیں گی۔ ایسے ہی امام مالکؒ کی ظاہر الروایت المدوّنہ میں مرتب ہوچکی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ شاہ صاحبؒ نے اسی تناظر میں سمجھایا کہ شریعتِ محمدیہ کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک نادر ہے۔ ظاہر الروایت جو ہوگی، وہ ان چار امورِ واقعیہ کے ذریعے سے آئے گی۔ اس کے علاوہ جو بھی ہے، وہ نادر الروایت ہے، انفرادی رائے ہے، انفرادی طور پر چیزیں آئیں گے۔ ان چاروں فقہی مکاتب کو مربوط طور سمجھانے کے لیے شاہ صاحبؒ نے کتابیں لکھیں۔

جادۂ قویمہ کی روشنی میں فہم علومِ قرآنیہ کا منہج

جادۂ قویمہ کی روشنی میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فہم منطوقِ قرآنی کے لیے علومِ تفسیر اور فہم منطوقِ احادیث سے متعلق علوم الحدیث اور فہم مذاہبِ کبارِ صحابہؓ کے لیے علوم الفقہ مرتب اور مدوّن کیے۔

شریعتِ مطہرہ کا سب سے پہلا منبع اور اخذِ علم کا مرکز قرآن حکیم کی نص اور اس کا منطوقِ کلام ہے۔ قرآن حکیم کی نصوص کو سمجھے بغیر فہم علم کا راستہ نہیں کھل سکتا۔ یہ راستہ سب سے زیادہ قوی اور عمدہ ترین ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''ان میں سب سے مضبوط قرآن حکیم کی ایسی نص ہے کہ کلام اسی معنی اور مطلب کے لیے لایا گیا ہو اور اہل زبان کے لیے اُس کی مراد اور مفہوم مخفی نہ ہو''

حضرت شاہ صاحبؒ نے منطوقِ قرآنی کے فہم کے لیے اصولِ تفسیر سے متعلق علوم مرتب اور مدوّن کیے۔

چناں چہ اُن کی کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" اس حوالے سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، جس کے پہلے باب میں انھوں نے منصوص ومنطوقِ قرآنی پر مبنی پانچ علومِ قرآنی کو بیان کیا۔ پھر دوسرے باب میں نظم قرآن کے معانی سمجھنے کی رُکاوٹوں پر مبنی امور کی نشان دہی کی اور اُن کا حل پیش کیا۔ مثلاً شرحِ غریب القرآن، ناسخ ومنسوخ کی بحث، اسبابِ نزول کی معرفت اور الفاظِ قرآنی اور معنی قرآنی سے متعلق بعض بنیادی امور کو سمجھنے کا مربوط نظام پیش کیا۔ پھر تیسرے باب میں اسلوبِ قرآن کی نُدرت کو بڑے منفرد انداز میں واضح کیا۔ پھر چوتھے باب میں تفسیری اسالیب اوران کے تحلیل وتجزیے پر مشتمل بڑی جامع گفتگو کی اور اپنے جامع اسلوبِ تفسیر کی وضاحت کرتے ہوئے وہبی طور پر حاصل کیے ہوئے علم تفسیر سے متعلق علوم کی نشان دہی کی۔ اپنا جامع اسلوبِ تفسیر متعین کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے علومِ قرآنیہ کے سلسلے میں نئے اور مفید علوم کے اضافے بھی کیے۔ شاہ صاحبؒ "الفوز الکبیر" میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے وہبی طور پر علم تفسیر میں مجھے یہ علوم عطا فرمائے ہیں:

1۔ قصص انبیاؑ کی حقیقت وماہیت کی تاویل وتشریح۔۔۔

2۔ قرآن حکیم میں بیان کردہ پانچ علومِ قرآنیہ کی توضیح۔۔۔

3۔ فارسی میں ایسا ترجمۂ قرآن، جو کہ عربی الفاظ کے عین مطابق ہے۔۔۔

4۔ علومِ خواص القرآن: قرآنی آیات کے خواص واثرات۔۔۔

5۔ "مقطّعاتِ قرآنیہ" کے معانی اوران کے مفہوم کا حل"

[۱] علم تاویل قصص الانبیاء

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے مجھ پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے قصص قرآنی، قرآن حکیم میں انبیا کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کی صریح فہم اوران کی تاویل وتفہیم کا دروازہ کھولا گیا۔ شاہ صاحبؒ نے اس پر "تاویل الأحادیث" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک انسانی معاشرے کے ارتقا کے کون کون سے مراحل ہیں اور ہر مرحلے میں کس نبی کا کام کس نوعیت کا ہے۔ تمام انبیا کے بنیادی اساسی اصول تو ایک تھے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "أصل الدّین واحد" لیکن ہر ایک کی شریعت ومنہج جو مختلف تھی، تو کیوں اور کیسے۔ اس کو علمی طور پر شاہ صاحبؒ نے مرتب اور مدوّن کر دیا۔

اس کتاب کے ساتھ "البدور البازغہ" کا تیسرا مقالہ ملا کر پڑھا جائے، جس میں اقوام اور ملل پر گفتگو کی ہے۔ قومیں کیسے تشکیل پذیر ہوتی ہیں؟ ملتیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ملتِ ابراہیمیہ حنیفیہ تک ملتوں کی اس بحث کو اس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو قرآن حکیم میں بیان کردہ

انبیا کی پوری تاریخ کا ایک مربوط خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔ انبیائے کرامؑ کے طریقۂ کار کی پوری نوعیت واضح ہوجاتی ہے۔ پھر اسی تناظر میں حضور اقدس ﷺ کی ارتفاقِ رابع یعنی بین الاقوامی نظام قائم کرنے تک کے کام کی نوعیت خوب روشن ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ سیرتِ نبویؐ پر یوں تو بہت سے لوگوں نے کام کیا ہے، لیکن "تاويل الأحاديث" کے آخر میں جو نبی اکرم ﷺ پر جامع اور پُر مغز گفتگو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی ہے، وہ لائق مطالعہ ہے۔ اس مختصر سے وقت میں ہم اس پر تفصیلی گفتگو نہیں کرسکتے۔ اس طرح ماضی کی تاریخ کے تجزیے پر مشتمل قصص قرآنی کی ایسی تشریح و تعبیر کی کہ جس سے ہر شعبۂ زندگی میں انعام یافتہ حضرات (انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین) کے فکر و عمل کی حقانیت اور مغضوب علیہم اور ضالین کے فکر و عمل کی گمراہی بڑی خوبی سے واضح ہوجاتی ہے۔ اس کی روشنی میں قرآنی علم الاحکام کی حقانیت کا پورا اثبات ہوجاتا ہے۔

[۲] قرآنی علومِ خمسہ

منطوقِ قرآن کے فہم کے لیے دوسرا اہم ترین پہلو علومِ خمسہ کے عنوان سے ہے۔ شاہ صاحبؒ نے الفوز الکبیر کے پہلے باب میں پانچ علوم؛ (۱) علم الأحكام، (۲) علم المخاصمه، (۳) علم التّذكير بأيّام الله، (۴) علم التّذكير بآلاء الله، (۵) علم التّذكير بالموت و ما بعدهٗ بیان کیے ہیں۔ ان علوم کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں ان پانچ علوم کے الفاظ رٹا دیے جاتے ہیں، لیکن ان پانچ علوم کی صحیح تفہیم اور منطقی توجیہ واضح نہیں کی جاتی۔ شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان علوم کے نزول کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ بلکہ وہاں تو سات علوم کے طور پر ذکر کیا ہے۔ لیکن یہاں الفوز الکبیر میں ان کا خلاصہ پانچ کی صورت میں مرتب کردیا ہے۔

ان پانچ علوم کو مربوط طور پر کچھ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی بھی انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے احکامات پر مبنی قانون اور شریعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا کا ہر مذہب وملت اپنی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے قوانین بناتا ہے۔ احکامات جاری کرتا ہے۔ اس طرح انسانی معاشرے کی ترقی کا بنیادی قانون اور ضابطہ دین اسلام کا "علم الاحکام" ہے۔ اس علم الاحکام میں عبادات بھی ہیں۔ ارتفاقات کی درستگی کا علم بھی ہے۔ انسانی کامیابی کے دُنیوی اور اُخروی اصول یعنی اَخلاقِ اربعہ کا علم بھی ہے۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے الفوز الکبیر میں تذکرہ کردیا کہ ہم یہاں علم الاحکام کی تفصیل نہیں بیان کریں گے۔ دوسری کتابوں میں یعنی حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحبؒ نے علم الاحکام پر تفصیلی گفتگو کردی ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جائے تو کسی بھی انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے صحیح علم اور عمل پر مبنی احکامات کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ جہاں دین اور اس کام کو سرانجام دینے کا ٹھیک ٹھیک (Perfect) عَملی ڈھانچہ آپ بتلائیں، دین کا صحیح علمی فکر اور نقطہ نظر دوٹوک انداز میں بتلائیں تو وہ علم صحیح ہوتا ہے اور

عمل صحیح ہوتا ہے۔ جس کو قرآن حکیم نے اپنے نزول کے حوالے سے بیان کیا ہے:

انا عرضنا الامانۃ .. الیٰ.... ظلوماً جھولاً.

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ انسان میں بہیمیت کے سبب جہالت اور ظلمت موجود تھی۔ اس کی ظلمت اور ناانصافی، عدل و انصاف کے معیار کے مطابق عمل کرنے سے دور ہوتی ہے اور اس کی جہالت، علم سے دور ہوتی ہے۔ تو جہالت اور ظلم کی ضد علم وعدل ہے۔ تو علم وعدل کی بنیاد پر جو فکر وعمل وجود میں آتا ہے اور اس کی اساس پر کوئی حکم جاری ہوتا ہے تو سوسائٹی ترقی کرتی ہے۔ اس طرح **علم الأحکام** کی روشنی میں انھوں نے یہ واضح کیا کہ صحیح علم وعمل پر مشتمل احکامِ شریعت جو منصوص ومنطوق قرآن سے ثابت ہیں، وہی حق ہیں۔ انھیں کے ذریعے سے انسانی سماج ترقی کرسکتا ہے۔

علم المخاصمہ کی صحیح حیثیت اس طرح سمجھی جائے کہ صحیح علم اور صحیح عمل پر مبنی قرآنی علم الاحکام سے متصادم فکر و عمل کے ممکنہ چار پہلو ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ علم تو ہو، لیکن اس پر مادی مفادات کی وجہ سے عمل نہ کیا جائے۔ جیسے یہودیت کے پاس تورات تھی، لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اشتروا بآیاتی ثمناً قلیلا.** (انہوں نے اللہ کی آیات کا بہت کم قیمت (دنیوی مفاد) میں سودا کرلیا) جبکہ دوسرے لوگ مغضوب علیہم ہیں۔ جیسے عیسائیت کے پاس درست علم ندارد، لیکن رہبانیت اختیار کرکے علم صحیح کے بغیر عمل کرتے جارہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی ضالین یعنی گم کردۂ راہ کی صورت میں ناکام ہیں۔ اسی طریقے سے وہ لوگ جو علم اور عمل دونوں کے منکر ہیں، مشرک ہیں۔ اور جو علم صحیح اور عمل صحیح یعنی اسلام کے احکامات کو بہ ظاہر قبول کرتے ہیں، لیکن اس کے فکری وعملی تقاضوں پر عمل نہیں کرتے، منافقین ہیں۔ تو قرآنی علم الاحکام سے متصادم ممکنہ شکلیں چار ہیں۔ قرآن نے ان چاروں گروہوں کے ساتھ مدلل مباحثہ کیا ہے۔ **علم المخاصمہ** کی روشنی میں ناقص علم اور ناقص عمل پر مشتمل چار مختلف فرقوں؛ یہودیت، عیسائیت، مشرکین اور منافقین کے فکر وعمل کی فکری اور عملی خرابیاں واضح کیں۔ اس طرح علم الاحکام سے متضاد جتنے بھی چار مکتبہ ہائے فکر یا سکول آف تھاٹ تھے، قرآن نے ان سے مکالمہ کیا اور ان کے شکوک وشبہات دور کرکے علم الاحکام کو مستحکم اور مضبوط بنایا۔

پھر شاہ صاحبؒ نے **علم التذکیرات** کی روشنی میں ماضی کی تاریخ، حال کے انعاماتِ الٰہیہ اور موت کے بعد کے حالات سے سبق سیکھنے اور موعظت حاصل کرنے کی حقیقت واضح کی۔ **علم الأحکام** درست طور پر سوسائٹی میں تبھی واضح ہوتا ہے کہ جب لوگوں کو یہ بتلایا جائے کہ جو حکم دیا گیا ہے وہ صحیح علم اور عمل پر مبنی ہے۔ یہ ماضی میں بھی درست تھا، حال پر غور وفکر سے بھی اسے سمجھا جاسکتا ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی اس کے درست نتائج آئیں گے۔ اس کے لیے تین تذکیرات ہیں: تذکیر بایام اللہ کہ کسی علم یا دین پر جب حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داوٗدؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے عمل کیا تو اس انعام یافتہ جماعت کے حق میں بہتر نتیجہ نکلا۔ اور ان احکامات کو نہ ماننے

والے نمرود، شداد، فرعون، قارون اور ہامان نے عمل نہیں کیا تو کیسا بُرا نتیجہ نکلا۔ اس تذکیر سے قرآنی علم الاحکام کی حقانیت واضح ہوتی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ تذکیر کوئی وعظ و نصیحت ہے بس۔ اس کا علم الاحکام کے فہم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ یہ تذکیرات دراصل علم الاحکام کی حقانیت کو واضح کرتی ہیں۔ علم تاویل الاحادیث پڑھا ہوا ہو تو یہ سمجھنا مزید آسان ہو جاتا ہے۔

اسی طریقے سے تذکیر بآلاء اللہ کی تفہیم ہے۔ انسان کے گرد و پیش میں جو ایک مربوط نظام سورج، چاند، ستاروں اور زمین پر معدنیات، نباتات اور حیوانات کی صورت میں انعاماتِ الٰہیہ موجود ہیں۔ ان کی روشنی میں قرآن حکیم نے اپنے احکامات کی حقانیت ثابت کی ہے کہ جب یہ کائنات ایک سسٹم کے تحت چل رہی ہے تو انسانی سوسائٹی کو ایک مضبوط سسٹم اور حکم کے تحت کیوں نہیں چلایا جا سکتا؟ یہ علم التذکیر بآلاء اللہ ہے۔

پھر قرآنی علم الاحکام پر عمل درآمد یا ان کے انکار کے اثرات و نتائج موت کے بعد ظاہر ہوں گے۔ گزشتہ واقعات کے تناظر میں اور موت کے بعد کے جو اعمال کے نتائج ہیں، اس کی گفتگو کے تناظر میں قرآن نے واضح کیا کہ جنھوں نے یہ عمل کیا، اس کی یہ حالتِ انعام ہے اور جنھوں نے غلط عمل کیا، ان کی یہ حالتِ سزا ہے۔

یہ علومِ خمسہ کی ایسی جامع تشریح اور منطقی توجیہ ہے کہ جس سے قرآنی علم الاحکام مربوط اور مستحکم طور پر ہر انسان کو سمجھانا آسان ہو گیا۔ علومِ خمسہ پر علمی بحث حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی دیگر کتابوں **حجۃ اللّٰہ البالغہ، سطعات اور البدور البازغہ** وغیرہ میں انتہائی محققانہ انداز میں بیان کی ہیں۔

[۳] ترجمہ قرآن حکیم کا جامع علمی اسلوب

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ مجھے ایک تیسرا علم دیا گیا "**علم ترجمۃ القرآن**"۔ قرآن حکیم کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا علم۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے "**المقدمہ فی قوانین الترجمہ**" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ لکھا۔ نیز اس کی روشنی میں "فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن" کے نام سے ایک معیاری ترجمہ قرآن پاک کیا اور اس کا مقدمہ لکھا۔ یہ تین کتابیں ہمارے پیش نظر رہیں تو شاہ صاحبؒ کا **علم ترجمۃ القرآن** ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے واضح کیا کہ قرآن حکیم کا ترجمہ انھیں الفاظ میں اسی جامعیت کے ساتھ ہونا چاہیے، جس طرح کہ عربی نظم ہے۔ ترجمہ نہ اس سے زائد ہو اور نہ کم۔ اور آیت کا مفہوم بھی پورا پورا ادا ہو۔ یہ تیسرا علم شاہ صاحب کہتے ہیں منطوقِ قرآن کے فہم کے لیے ضروری ہے۔ عربوں کے لیے تو عربی ٹھیک ہے، لیکن غیر عربوں کو اگر منطوقِ قرآن سمجھانا ہے تو جامع اسلوب میں اس کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ تبھی قرآن حکیم کا صحیح منطوق سمجھ میں آئے گا۔ ورنہ تو ادھورا اور ناقص مفہوم سمجھیں گے۔ اس طرح شاہ صاحبؒ نے ترجمہ نگاری کے ناقص اور ادھورے اسالیب کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے ترجمے کے صحیح اصول اور ضابطے اور قوانین واضح کیے۔

[۴] علمِ خواص القرآن

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ مجھے چوتھا علم "علم خواص القرآن" دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی آیات اور بالخصوص الاسماء الحسنیٰ، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے ننانوے نام، انسانی روح کو ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت کیسے حاصل کراتے ہیں۔ قرآن حکیم کے خواص سے متعلق علوم کی وضاحت کے لیے حضرت شاہ صاحبؒ نے "الخیر الکثیر" تحریر فرمائی، جس میں انسانی روح کو ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ سچا تعلق قائم کرنے کے لیے اسماء الحسنیٰ اور قرآنی آیات کے خواص اور تاثیرات کی نشان دہی کی ہے۔ قرآن حکیم میں روح کی ترقی اور تربیت کے لیے خود قرآن حکیم کی تلاوت اور اس کی روح کے ساتھ اپنے قلب کو جوڑنے سے جو فیضان یا فتح عظیم جو شاہ صاحبؒ پر کھلا، شاہ صاحبؒ نے اسے واضح کیا۔

تصوف کا صحیح راستہ قرآن کے فیض سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر قرآن کے فیض سے ہٹ کر محض شخصیات کی قیود ات میں یا تقلیدات میں رہا جائے تو یہ شخصیات کے رجعت پسندانہ تصور کو ہی روح پر مسلط کر دیتا ہے۔ اس سے آزادیٔ روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس پر "تفہیماتِ الٰہیہ" میں شاہ صاحبؒ نے بحث کی ہے۔ یہ وہ علم نہیں جو تعویذات اور گنڈوں کے نام پر کاروبار بن چکا ہے یا علم الاعداد کی بنیاد پر بیان کیا جاتا ہے۔ یہ وہ علم خواص القرآن ہے، جو روح کے سلوک اور اخلاص اور تزکیے کے لیے بنیاد بنتا ہے۔

یہ علم اس تناظر میں بڑا اہمیت رکھتا ہے کہ رسمی صوفیا نے انسانی تزکیے اور تربیت کے نام پر خود ساختہ وظائف اختیار کر لیے تھے اور جاہل صوفیا کے ذریعے سے ایسی رسومات کی شکل اختیار کر لی گئی، جو قرآن حکیم کی تعلیمات سے متصادم تھیں۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے علومِ خواص القرآن کے ذیل میں تربیت اور تزکیے کا ایک مکمل علمی نظام واضح کیا۔ ان علوم کی اَبحاث حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی دیگر کتابوں؛ سطعات، لمحات اور الطاف القدس میں بھی بیان کی ہیں۔

[۵] حروف مقطّعاتِ قرآنیہ کا علمی حل

پانچواں علم جس کے بارے میں شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ مجھ پر اللہ پاک نے اس کا دروازہ بھی کھولا، وہ حروفِ مقطعات کے معانی اور مفاہیم کا علم ہے۔ یاد رہے کہ یہ علم قطعی نہیں ہے، بلکہ ظنی ہے۔ قرآن حکیم جس زبان میں نازل ہوا ہے، اس کا ہر حرفِ تہجی اپنا ایک معنی اور مفہوم رکھتا ہے۔ عربی دنیا کی واحد زبان ہے کہ جس کا ہر حرف اپنی ایک معنویت رکھتا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے "براہین قاسمیہ" میں لکھا ہے کہ: دنیا کی دیگر زبانوں کے حروفِ تہجی اس وقت تک کوئی معنی نہیں دیتے، جب تک وہ باقی حروف کے ساتھ مل کر اسم یا فعل نہ بنیں۔ لیکن واحد زبان عربی ہے کہ جس کی فقہ اللغۃ اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ اس کے ہر مادے یعنی فعل کا فا، عین اور لام کلمے کا ہر حرف

اپنی حرفی حیثیت میں بھی ایک معنویت رکھتا ہے۔ اور جب وہ کسی فعل یا اسم کی حیثیت میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے فا، عین اور لام کلمے میں موجودگی کے باعث اس اسم اور فعل کی معنویت میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآنی سورتوں کے شروع میں آنے والے حروفِ مقطعات کی تحقیقی اور عملی تشریح کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''الفوز الکبیر'' کے پانچویں باب کی ایک مستقل فصل میں بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ جس میں شاہ صاحبؒ نے عربی زبان کے حروفِ تہجی کی ترتیب و تدوین اور اُن کی معنوی اثرات و نتائج پر بحث کرتے ہوئے فقہ اللغہ کی روشنی میں حروفِ مقطعات کے مفاہیم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے سے متعلق ہر حرفِ تہجی کی معنویت واضح کرنے کے لیے ''الخیر الکثیر'' میں بھی بہت عمدہ بحث کی ہے۔

یہ پانچ علوم ایسے ہیں کہ قرآن حکیم کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ انسانی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے جن بنیادی اساسی امور کی ضرورت ہے، وہ ان پانچ علوم میں بیان ہو جاتے ہیں۔ ان علوم کی پوری حقیقت کا فہم رکھتے ہوئے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا جائے تو انسانی معاشرے کی تشکیل میں شریعت، طریقت اور سیاست پر مبنی تمام دینی پہلوؤں کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ جن علمائے ربانیین نے ان علومِ قرآنیہ کا فہم و شعور حاصل کیا، وہ قرآنی تعلیمات کے پھیلاؤ کے لیے کام کرنے والے مجددین علمائے ربانیین کا حصہ بنے۔ اور انھوں نے ان کے فیوض و برکات سے بہت استفادہ کیا۔

جادۂ قویمہ کی روشنی میں علوم الحدیث کی تفہیم

جادۂ قویمہ کا دوسرا شعبہ تھا احادیثِ مستفیضہ۔ شاہ صاحبؒ نے اس کے لیے بھی اہم بنیادی بات کہی۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس زمانے میں ہر طبقہ حدیث پر بحث کر کے حدیثِ مستفیض یا مشہور یا احادیث کے بارے میں تحقیق و تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے اس زمانے میں جو کتبِ حدیث ہیں، اس کے طبقات بنائے ہیں۔ ''حجة الله البالغه'' میں ''باب طبقاتِ كتب الحديث'' مرتب کر کے چار طبقاتِ حدیث بیان کیے اور اس میں بتلایا کہ احادیثِ مستفیضہ امام مالکؒ کی مؤطا، بخاری اور مسلم کی صحیحین میں پائی جاتی ہیں۔ جس پر یہ تینوں متفق ہیں اور جن پر امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا، یا صحابہؓ یا اُن کے بعد کے طبقہ میں کوئی تعارض نہ ہو۔ قرآن کے بعد احادیثِ مستفیضہ کا درجہ ہے۔ اور پھر ان کے لیے بھی شاہ صاحب نے چار پانچ شرائط بیان کی ہیں (وقت کی قلت کے سبب یہاں ذکر ممکن نہیں)

جادۂ قویمہ کی روشنی میں کبار صحابہؓ کے مذاہب کی تفہیم

اسی طریقے سے تیسری بنیادی چیز جادۂ قویمہ کی، وہ کبارِ صحابہؓ کے مذاہب کا تعین ہے۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے مرکز اور محور بنایا ہے مؤطا کو۔ اور مؤطا کی ایک نئی ترتیب ''المسوى من احاديث المؤطا.'' میں قائم

کی ہے۔ اور شاہ صاحبؒ نے کہا: کبار صحابہؓ میں احکام کی تفصیلات کے حوالے سے چار بنیادی صحابہ ہیں: حضرت عمر فاروق، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور ان میں بھی مرکزی شخصیت حضرت امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ ان کے اقوال، فقہائے سبعہؒ کے تناظر میں شاہ صاحبؒ نے المسوی میں جمع کر دیے۔

اور پھر ان حضرات کے مذاہب پر شاہ صاحبؒ نے اپنی کتابوں "**عقد الجید فی الاجتهاد و التقلید**" میں اور اسی طریقے سے "**الانصاف فی بیان سبب الاختلاف**" میں اور "**حجّة الله البالغة**" میں گفتگو کی ہے، اس تناظر میں شاہ صاحبؒ نے کہا کہ دیکھو! دو ہی تعامل کے مرکز ہیں۔ ایک تعامل اہل مدینہ ہے، جو حضرت عمر فاروق، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ وغیرہ سے ہوتا ہوا حضرت امام مالکؒ تک آتا ہے، جس کو امام مالکؒ نے موطا میں مدوّن کر دیا۔ اور دوسرا تعامل اہل کوفہ ہے۔ کوفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بسایا، بین الاقوامی مرکز تھا اور دنیا بھر کی تمام فوجوں کی چھاؤنیاں وہاں تھیں۔ وہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے قریب ترین فرد اور فقیہ اور مجتہد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو پہلے بھیجا، پھر حضرت عبداللہ بن مسعود کے بعد حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا بہ طور امیر المؤمنین کوفہ اور بصرہ میں قیام رہا۔ کوفہ اور بصرہ میں جو صحابہؓ گئے، اُن کا تعامل بھی اہمیت رکھتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ ایک تعامل کی نمائندگی امام مالکؒ نے کی اور امام مالکؒ کے اس تعامل پر جو تنقید مکہ سے امام شافعیؒ نے کی، یہ بھی تعامل اہل مدینہ کا ہی مکتبِ فکر ہے۔ اور پھر اس کے مقابلے پر جو اہل کوفہ تھے، یہاں ابراہیم نخعی اور پھر ان سب حضرات کا فقہی مسلک امام اعظم امام ابوحنیفہؒ نے مرتب کیا۔ اس کے بعد امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے "**کتاب الحجه علیٰ اهل المدینه**" لکھی۔ جس میں اہل مدینہ کے تعامل پر، تعاملِ اہلِ کوفہ کے تناظر میں گفتگو کی۔ اس تناظر میں شاہ صاحبؒ نے ان دونوں تعامل کو سامنے رکھا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب "**المسویٰ**" میں صحابہ کرامؓ کے اقوال کے علاوہ فقہ حنفی، فقہ مالکی اور فقہ شافعی کی آرا ان کی مستند کتابوں سے جمع کیں اور تجزیہ کر کے ایک رائے قائم کی۔

یہ کبارِ صحابہؓ کا متفق علیہ رائے کا عمل ہے اور اس میں اگر کہیں اختلاف پایا گیا ہے تو اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے ایک اَور علم دریافت کیا ہے علم تطبیق الآراء کہ ان تینوں مکاتب ہائے فکر کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کا کام کیا۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس وقت پوری دنیا میں فقہ شافعی اور فقہ حنفی اور ایک مخصوص خطے میں فقہ مالکی ہے، انھیں کا تجزیہ کرنے سے جامع تصورِ دین سامنے آجاتا ہے۔ اس طرح "**المسوی**"، مکمل ہوئی۔

اور پھر صحیح اور حسن احادیث کے لیے الترمذی، ابوداؤد اور النسائی کی تین کتابوں کو، یعنی طبقہ دوم کی کتابوں کو آپ نے رکھ کر **الجادة القویمه** کو مکمل کر دیا۔ گویا کہ اخذِ علم کے جو بنیادی اصول اور ضابطے تھے، ان کی تحقیق و ترتیب پر گفتگو کی۔

علم السیاسۃ والخلافۃ کی ترتیب و تدوین

اسی طرح شاہ صاحب نے ان تمام علوم کی سمجھ کے لیے علم السیاسۃ و الخلافۃ بھی مرتب اور مدوّن کیا۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" لکھی۔ جس میں خلفائے راشدین، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی خلافت کی روشنی میں سیاست اور خلافت کے امور متعین کیے۔ ان حضرات میں بھی وہ مرکزی شخصیت، جن کے زمانے میں سسٹم اور ادارے بنے، وہ حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ کو مرکزی شخصیت قرار دے کر "ازالۃ الخفاء" کی دو جلدوں میں گفتگو کی۔

اس حوالے سے انھوں نے تین بنیادی اساسی اصول متعین کر دیے۔ ایک شریعت، دوسرا طریقت اور تیسرا سیاست۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ نے "فقہ عمرؓ" پر ایک رسالہ لکھ کر ایک مرتب اور مدون فقہ واضح کر دی اور یہ بتلایا کہ دراصل حضرت عمرؓ مجتہدِ مطلق مستقل ہیں۔ اور یہ چاروں فقہا امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ، گویا کہ "فقہ عمرؓ" کے مجتہدین منتسبین ہیں۔ ان چاروں میں وہاں اختلاف ہوتا ہے، جہاں صحابہؓ کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور جہاں صحابہؓ کا اتفاق ہوتا ہے، یہ چاروں اُس پر متفق ہوتے ہیں۔ اس طرح اجتماعیت کے نقطۂ نظر سے شاہ صاحبؒ نے پوری فقہ مرتب اور مدوّن کر دی۔

اسی طریقے سے شاہ صاحبؒ نے ایک رسالہ "تصوفِ فاروقِ اعظمؓ" لکھا اور اس میں بہت ہی نئی اور اہم باتیں کہیں ہیں، جو طریقت کے حوالے سے شاہ صاحبؒ سے پہلے کسی صوفی نے نہیں کہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس میں یہ بات بھی واضح کی کہ سلسلۂ تصوف کے بانی بھی دراصل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ ہیں۔ تصوف کی جو بنیاد حضرت جنید بغدادیؒ نے بتلائی اور ابوطالب مکیؒ نے "قوت القلوب" میں بیان کی ہے، وہ مقامات یقین، نو بنیادی اُمور ہیں: توبہ، صبر، شکر، رجاء، خوف، زہد، توکل، رضا اور محبت۔ تو شاہ صاحبؒ نے ان بنیادی اساسی اصولوں کو منطوقِ قرآن سے، احادیث سے، حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہؓ کے عمل سے مرتب اور مدوّن کر دیا۔ اور انھوں نے کہا کہ اس سلسلۂ تصوف میں حضرت عمر فاروقؓ کے جانشین حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ اور کوفہ میں ان کے نائب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ اور پھر یزید بن اسودؒ اور علقمہؒ سے ہوتے ہوئے ابراہیم نخعیؒ اور پھر سفیان ثوریؒ، داؤد طائیؒ، معروف کرخیؒ، سری سقطیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ تک سلسلہ بیان کیا ہے۔ حضرت علیؓ سے آگے جو اُن کے خلفا یا شاگرد ہیں، ان کے واسطے سے سلسلہ بیان کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے حضرت حسن بصریؒ کو حضرت انس بن مالکؓ کا تربیت یافتہ قرار دیا ہے۔ اور پھر اس واسطے سے جنیدِ بغدادیؒ تک پورا سلسلہ بیان کیا ہے (یہاں پر ہم اختصار سے کام لیتے ہیں۔ کسی موقع پر ان شاء اللہ تفصیلی گفتگو کریں گے کہ شاہ صاحبؒ نے ازالۃ الخفاء میں سلوکِ عمرؓ کا ایک نیا پہلو علمی بنیادوں پر بیان کیا ہے)

شاہ صاحبؒ نے تیسرا رسالہ ''سیاستِ عمرؓ'' پر ''کلمات امیر المؤمنین عمر بن الخطاب فی سیاسة الملک و تدبیر المنازل'' لکھا ہے، جس میں حضرت عمر فاروقؓ کے سیاسی اقوال اور سیاسی حکمت سے متعلق امور بیان کیے ہیں۔ سیاسی اور معاشی حوالے سے اُن کی آرا کو شاہ صاحبؒ نے جمع کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے بتلایا کہ معاشی نقطہ نظر سے کون کون سے قوانین عمر فاروقؓ نے متعارف کرائے اور سیاسی نقطہ نظر سے کون کون سی حکمت آمیز باتیں بیان کی ہیں، وہ تمام اقوالِ عمرؓ ایک جگہ پر جمع کر دے ہیں۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے علمِ دین کا ایک مستقل ڈھانچہ کھڑا کیا ہے۔ اور پھر اسے ''خلافت راشدہ علیٰ منهاج النبوہ'' یا ''خلافتِ خاصہ'' قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ''خلافتِ عامہ'' کا ایک تصور دیا، جس میں خلافتِ بنواُمیہ سے شروع ہو کر خلافتِ بنوعباس اور خلافتِ بنوعثمان تک دینِ اسلام کی حکمرانی کا ایک مکمل خاکہ شاہ صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔ اس وقت اس پر گفتگو کریں تو بہت سا وقت اس پر لگ جائے گا۔ یہ بھی مستقل موضوع کا طالب ہے، جس پر گفتگو کی جاسکتی ہے کہ خلافت اور حکومت کیا ہے؟ خاص طور پر آج اس دور میں ''خلافت و ملوکیت'' کے عنوان سے بھی اور ''خلافت بہ مقابلہ جمہوریت'' کے عنوان سے بھی کچھ غیر منطقی اور غیر علمی باتیں اسلام کے نام سے کی جارہی ہیں۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ کا نقطہ نظر بہت جامع، دوٹوک، قطعی اور منطقی ہے۔

علم تطبیق الآرا کی ترتیب و تدوین

اسی کے ساتھ ساتھ شاہ صاحبؒ نے یہ کام کیا کہ ان تمام علوم --- علوم القرآن، علوم الحدیث، علوم الفقہ، علوم التصوف اور علم الحقائق --- میں جمع و تطبیق کے لیے ایک مستقل علم ''علم تطبیق الآرا'' دریافت کیا۔ اس حوالے سے بھی شاہ صاحب پہلے فرد ہیں، جنھوں نے یہ علم تطبیق الآرا مرتب اور مدوّن کیا۔ اس کے قاعدے اور ضابطے اور اس علم کی دیگر تفصیلات کے لیے شاہ صاحبؒ کے صاحبزادے امام شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے مستقل کتاب ''تکمیل الاذهان'' لکھی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے چوتھے باب ''الباب الرابع فی تطبیق الاراء'' میں اس فنِ تطبیق الآرا کی تاریخ، موضوع، غرض و غایت، اس کے قاعدے اور ضابطے مرتب اور مدوّن کیے ہیں۔ اور اسی کے متعلق ایک بحث مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ نے ''العبقات'' میں کی ہے۔ اور عبقات بھی تصوف کے اہم مسائل پر اسی علم تطبیق الآرا سے متعلق ہے، جس میں تصوف کے ایک اہم ترین پہلو ''تجلّی'' پر بڑی تفصیلی گفتگو حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حقائق کائنات کے تناظر میں کی ہے۔ اس میں صوفیا کی مختلف آرا میں تطبیق پیدا کی گئی ہے۔

وقت کی کمی کے سبب علم تطبیق الآراء کے حوالے سے بنیادی اور مختصر سی بات عرض کروں گا۔ شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے بنیادی سی بات یہ کہی ہے کہ تطبیق سے مراد قطعی طور پر نہیں ہے کہ کسی بھی معاملے میں دو مختلف آرا آئی ہوں، تو تطبیق دیتے ہوئے ان میں سے کسی رائے کو بالکل غلط قرار دیا جائے، یا کسی ایک رائے پر مبنی دعوے کی نفی کر دی جائے۔ اسی طرح دونوں آرا کو کسی ایک ہی اصول سے پھوٹنے والی دو شاخیں قرار دینا بھی تطبیق کا مقصد نہیں۔ یہ بھی

تطبیق کا مقصد اور مراد نہیں کہ ایک کا قول دوسرے پر منطبق کیا جائے اور دوسرے کا قول پہلے پر منطبق کیا جائے اور ان کی اصل رائے کو مسخ کر دیا جائے۔ تطبیق کا مفہوم شاہ صاحبؒ نے یہ واضح کیا ہے کہ کائنات کے حقائق، انسانیت کے حقائق اور گردوپیش کی سوسائٹی کے حقائق ''واقع'' کے مطابق معلوم کیے جائیں۔ ان کا تعین **بالعیان او البرهان**، یعنی عقلی طور پر اور مشاہدے کے بعد کیا جائے اور متعلقہ معاملے کے حقائق کا تعین کرنے کے بعد اختلافی آرا میں سے کسی رائے کے بارے میں یہ دیکھا جائے کہ وہ متعین کردہ حقائق کے کس قدر قریب واقع ہوئی ہے۔ اور کس قدر حقائق سے انحراف کیے ہوئے ہے، یعنی اصل حقائق سے وہ رائے کس قدر دور ہے یا قریب ہے۔ یعنی پہلے اصل واقع کا تعین کرنا اور پھر اس واقع کے تعین کے بعد مختلف آرا کا تحلیل و تجزیہ کر کے اس رائے کا کون سا پہلو درست ہے اور کون سا غلط ہے، اس کا تعین کرنا اس حوالے سے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے یہ علم مرتب کر کے فلاسفہ یونان کے فلسفیانہ افکار کی انحراف کی حالت واضح کی ہے۔ نیز ان میں سے اگر کوئی پہلو درست یا صحیح ہے تو اس کا تعین بھی کیا ہے۔ اسی طرح دیگر تمام شعبوں، جن میں تصوف کا شعبہ ہے، علم الحقائق کا شعبہ ہے، فلسفے کا شعبہ ہے، فقہی اختلافات ہیں، حدیث کے اختلافات ہیں، تفسیری اختلافات ہیں، ان تمام شعبوں کی ایک ایک دو دو مثالیں شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے اپنے اس رسالے میں واضح کی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک وسیع ترین علم ہے۔ اس سے ''**علم الجمع بين المختلفات**'' کا ایک حقیق خاکہ سامنے آتا ہے۔ یہ تطبیق الآرا کا علم ہو تو اس سے بات کو درست تناظر میں سمجھنے کی کیفیت اور حالت پیدا ہوتی ہے۔

علم اسرار الدین کی تدوین و ترتیب

تطبیق الارا کے اس علم کا جو مرکز اور منبع ہے، وہ علم اسرارِ دین ہے۔ علم اسرارِ دین ایک مستقل علم ہے۔ یہ دراصل **فلسفة التشريع الاسلامی** کا متعین کرنا ہے۔ گویا کہ دین اسلام کے مکمل تمام علوم اور پھر دین اسلام ہی نہیں، باقی جتنے فلسفہ ہائے مکاتبِ فکر کی روشنی میں بھی انسانی ترقی کے قواعدِ کلیہ کا تعین کیا ہے۔ یعنی حقائق پر مبنی قواعد کلیہ مسلمہ کا تعین کیا ہے اور پھر ان قواعدِ کلیہ مسلمہ سے جو ذیلی اور ضمنی قوانین وجود میں آتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جو سیاسی، معاشی، سماجی سسٹم بنتا ہے، اس پورے مجموعے کا عنوان ''علم اسرارِ دین'' ہے۔ (علم اسرار دین پر ان شاء اللہ اگلے لیکچر میں تفصیل سے گفتگو کریں گے)

عصرِ حاضر میں فکرِ ولی اللّٰہی کی ضرورت کیوں؟

یہ شاہ صاحبؒ کے علوم و افکار کا ایک اجمالی سا خاکہ ہے۔ اب ہم تھوڑی سی گفتگو اس پر کر لیں کہ آج اس دور میں یعنی عصر حاضر میں اس ولی اللّٰہی فکر کی ضرورت کیوں ہے؟ شاہ صاحبؒ کے فکر کی ضرورت اس لیے ہے کہ آج ہمارے ہاں فکری انتشار کی تقریباً وہی حالت ہے، جو شاہ صاحبؒ کے زمانے میں تھی۔ آج ہمارے زمانے میں بھی

گزشتہ دو ڈھائی سو سال سے جاری سیاسی عدمِ استحکام اور غلامی کی وہی حالت ہے، جو شاہ صاحبؒ کے زمانے میں تھی۔ معاشی نقطہ نظر سے ویسا ہی طبقاتی نظام اور ویسا ہی لوٹ کھسوٹ کا عمل، بلکہ وہ لوٹ کھسوٹ کا عمل انگریزوں کے زمانے میں زیادہ سائنٹفک طریقے سے ہوگیا کہ جب ہندوستان جو سونے کی چڑیا تھی، کی دولت لوٹ کر دریائے ٹیم (River Team) کے کنارے برطانیہ پہنچادی گئی اور ہندوستان میں انگریز آئے تو وہ خوش حال ترین ملک تھا اور جب گئے تو برعظیم پاک و ہند مقروض ترین ملک بن گئے۔

یہ معاشی حالت اور اس کے بعد ستر سالوں میں جو معاشی حالت آج ہماری ہو چکی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں فکری انتشار ہے، سیاسی عدمِ استحکام ہے، معاشی و اقتصادی تباہی بربادی ہے۔ سماجی حالات کی خرابی ہے۔ اور علم کی حالت یہ ہے کہ آج ہم اہلِ علم فرقوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کو کافر بنانے، سوسائٹی کو انتشار میں مبتلا کرنے، جاہلانہ حرکتیں کرنے، ایک دوسرے کی گردن مارنے اور مذہب فروشی کے کام کر رہے ہیں۔ جب کہ دنیا کی ظالم قومیں اس بات کا بانگِ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ ہم نے ترقی کی ہے مذہب کو چھوڑ کر۔ مذہب جہاں بھی ہوگا، وہ انتشار کا باعث بنے گا اور تباہی بربادی لائے گا۔ سرمایہ داری نظام والے کہتے ہیں کہ ہم نے ترقی کی ہے مذہب کو چھوڑ کر۔ سوشلسٹ کہتے ہیں کہ ہم نے ترقی کی ہے مذہب کو چھوڑ کر۔ تو آپ بتلایئے کہ ایسے ماحول میں جہاں مذہب کے خلاف خود ہمارے اپنے عمل و کردار نے اور غیروں کی یلغار نے مذہب کو تنقید کا نشانہ بنایا، وہاں دین اور مذہب کی وہ علمی جامع تعلیم اور فکر و فلسفہ جو سوسائٹی میں وحدت پیدا کرنے، سوسائٹی کی سیاسی، معاشی، سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک بنیادی کردار ادا کرنے والا جامع فکر ہے، ہم متلاشیانِ علم کو تو ضرور اسے سیکھنا چاہیے۔

یہ بات اپنی جگہ ہے کہ عوام جو ہیں وہ اہل علم کی علمی باتیں نہیں سمجھ سکتے، لیکن ہماری تو ضرورت ہے۔ دین کے ساتھ اگر ہم اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہیں۔ دین کے نام پر اس ملک کے بنانے کے دعوے کیے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ دین کا ایک مربوط علمی بیانیہ کیا ہے؟ اس کا علمی فکر کیا ہے؟ آج ہمارے ملک کے اندر مخمصہ پیدا کر دیا گیا کہ دین کا بیانیہ کیا ہے؟ اور بیانیے کے نام پر انتشار پیدا کرنا، انفرادی رائے قائم کرنا اور ایک دوسرے کے خلاف فتوے بازی کا عمل کرنا یہ سوسائٹی کی بہت بڑی تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فکر، دین کا ایک صحیح، جامع مکمل بیانیہ واضح کرتا ہے، نہ صرف بیانیہ، بلکہ اس کا علمی تجزیہ، فکر و فلسفہ، عملی نظام اور ایک مربوط ڈھانچہ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اس جامع فکر و عمل کو سمجھنے اور اس کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین!

سوالات و جوابات

سوال

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دیگر مکاتب فکر کے حوالے سے، دیگر فقہا کے حوالے سے اتنا عمدہ کام کیا ہے، لیکن ہمیں اس کی ظاہری تطبیق (implementation) نظر نہیں آ رہی۔ ان کی فکر کو اس طرح سے پذیرائی نہیں ملی یا لوگوں نے اس کو اس طرح سے قبول (accept) نہیں کیا۔ تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب

مختصر جواب اس کا یہ ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ باہر سے آنے والی طاقت کی غلامی کا دور شروع ہو جانا ہے۔ جب قوم غلام ہو جاتی ہے تو اپنے فیصلے خود کرنے کی اہلیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یہ کام جس زمانے میں کیا کہ اس وقت غلامی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ان کی تحریک پر اگر عمل ہوتا اور مسلمان اس وقت جاگ جاتے اور اپنی آزادی کی بقا برقرار رکھتے اور ہندوستان غلام نہ ہوتا تو ضرور نتائج مختلف ہوتے، لیکن جب غلامی شروع ہو گئی۔ آپ کے فیصلوں پر اختیار آپ کو نہیں رہا۔ یہ اختیار دوسروں کے پاس چلا گیا۔ تو پھر علم کے جو پُرانے اور فرسودہ طریقے تھے شاہ صاحبؒ سے پہلے کے، وہ آگے آ گئے اور شاہ صاحبؒ کا علمی و فکری مکتبِ فکر دب گیا۔ اس کے لیے میں وجہ (reason) بیان کروں گا۔

آپ دیکھئے کہ جب 1765ء میں بنگال اور اُڑیسہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس گئی۔ مغل حکمران شاہ عالم کے ساتھ معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے میں ایک شِق لکھی گئی کہ عدالتی اور قانونی نظام دین اسلام ہی کا رہے گا، منصبِ عدالت پر علما اور قضاۃ برقرار رہیں گے۔ اور جب انگریزوں نے اپنا مالیاتی دیوانی معاملہ اپنے قبضے میں لے لیا، مال اُن کے قبضے میں چلا گیا۔ اب عدالتی نظام صوبوں میں قائم کرنے کے لیے علما کو بھرتی کرنے کا نظام بنانا پڑا۔ تو اب سوال پیدا ہوا کہ کون علما ہوں؟ تو انھوں نے طے کیا کہ علما وہ ہوں گے، جو فرنگی محل کے ہوں۔ اس کے جو پڑھے ہوئے فاضلین ہوں گے، وہ قاضی اور مفتی اور جج بنیں گے۔ فرنگی محل میں جو درسِ نظامی پڑھایا جاتا تھا، وہ پُرانے طریقے کے مطابق تھا۔

جب کہ شاہ صاحبؒ نے سو سال بعد اس پورے نصاب میں تبدیلی کی۔ مدرسہ رحیمیہ کا نصاب، فکر اور نظام بنایا۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور اُن کے شاگردوں سے یہ علوم آگے پھیلے، لیکن حکومت میں جانے کا راستہ اس نصاب سے تو نہیں

تھا۔ اب ملا نظام الدین سہالویؒ کے اُس نصاب میں صحاحِ ستہ نہیں تھیں۔ تو احادیثِ مستفیضہ کا وہ جادۂ قویمہ کہاں سے ہوتا؟ وہاں تو صرف فقہ اور اصولِ فقہ اور حدیث میں تبرک کے لیے محض مشارق الانوار یا مشکوٰۃ شریف پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ تو حدیث پر بحث ہی کوئی نہیں تھی۔ قرآن حکیم کے حوالے سے تفسیر بیضاوی پڑھائی جاتی تھی، جس میں قرآن حکیم کا کوئی تفصیلی تعارف تو در کنار بلکہ تفسیر کے نام پر پہلے پارہ کے ایک پاؤ کے اندر ہی سارا سال گزار دیتے ہیں۔ ہمارے مدرسوں کا نصاب بھی وہی چلتا رہا۔

1857ء میں جب انگریزوں نے یہاں مکمل قبضہ کر لیا تو انھوں نے آتے ہی وہ سب ختم کر دیا کہ اب کسی مولوی کو بھرتی نہیں کریں گے۔ 1835ء میں لارڈ میکالے نے جو نیا نظامِ تعلیم بنایا، اُس میں اُس نے کہا کہ جو عربی اور فارسی پڑھے ہوئے ہیں، وہ تو عالم ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کو کسی منصبِ قضا اور عدالت پر نہیں بٹھایا جا سکتا۔ اور جو پُرانے چلے آ رہے تھے، تو ان کو 1857ء میں قتل کر دیا گیا۔

اب آپ دیکھیے کہ ولی اللّٰہی فکر جو ہے، یہ پورے سو سال میں آگے نہیں بڑھ سکا۔ کیوں کہ سرکاری ملازمت اور مداخلت تعلیمی نظام کے اندر رہی اور 1857ء کے بعد وہ رہی سہی کسر بھی ختم ہوگئی۔ حدیث کا بھی وہی طریقہ جو پُرانا تھا، وہی چلتا رہا۔ تاہم دیوبند میں کچھ عرصہ دار العلوم کا جو آغاز ہوا تو ولی اللّٰہی نصاب مدرسہ رحیمیہ کا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ یہاں لائے اور پچاس سال تک وہاں رہا اور اس کے نتیجے میں کچھ علما تیار ہوئے؛ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ یا مفتی کفایت اللہؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ تک، جنھوں نے اس علم کو بھی پڑھا اور اُس درسِ نظامی کی قیل وقال بھی پڑھی۔ تا کہ مروجہ طریقہ میں بھی وہ عالم ہوں، لیکن ولی اللّٰہی فکر کا نصاب بھی ان کے سامنے رکھیں۔

اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہم نے اجازت دے دی کہ ہر آدمی جیسا چاہے مدرسہ بنائے اور اُس کے اوپر جامعہ کا نام لگالے، چاہے اس کے اندر حفظ کی کلاس ہی کیوں نہ ہو، اسے بھی یونیورسٹی قرار دے دیا۔ جب کہ یونیورسٹیوں میں ہمارا علمی ماحول یہ ہے کہ وہاں بس کچھ علوم کے خلاصے (notes) تو بیان کیے جاتے ہیں، لیکن پورا علمی اور فکری مربوط نظام تھا، یا اس کی تحقیق و تدوین کا عمل ہے، وہ پس پشت چلا گیا۔ درست تعلیم کے پھیلنے کے لیے تو با قاعدہ مستحکم نظام اور آزادی وحریتِ فکر کی رائے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال

آپ نے فرمایا کہ افکار کا ایک انتشار ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہماری فکر متحد ہو جائے۔ اور پھر اس وقت بڑے بڑے لوگ جو خلافت بمقابلہ جمہوریت میں موجود ہوں تو کیسے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو کر علمی طور پر شاہ صاحبؒ کے جو افکار آپ نے بیان کیے ہیں، ان پر ہم کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟

جواب

پہلے تو اہلِ علم اس کی ضرورت محسوس کریں کہ ہمیں واقعتاً اپنی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے بنیادی اساسی امور

پر ہمیں متفق ہونا چاہیے۔ اور اس متفق ہونے کے لیے ہمیں ان علوم کو اس تناظر میں پڑھنے کی ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم وحدت یا اتحادِ اُمت کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں یہ آتا ہے کہ اس اتحاد اور وحدتِ فکر میں تمام لوگوں کی جزوی یا انفرادی آرا ختم ہو جانی چاہئیں؟ سب کے سب ایک ہی رائے اور ایک بات پر ہوں تو پھر تو اتحادِ اُمت ہے۔

دیکھیں! یہ اتحادِ اُمت کا تصور بھی غلط ہے۔ بنیادی اساسی امور میں اتفاق ہوتا ہے۔ اور اس میں کسی فرقے کا عموماً کوئی اختلاف نہیں۔ کیا عبادات میں ہمارا کوئی اختلاف ہے؟ پانچ اوقات کی نمازیں، روزے میں، حج میں، زکوۃ میں؟ اسی طریقے سے جیسے ان میں ہمارے اتفاق ہیں، اب زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ایک نے ایک صحابی کی روایت پر عمل کر کے نماز میں رفع یدین کو ضروری قرار دے دیا اور ایک نے کسی دوسرے صحابی کے نقطۂ نظر پر کہا کہ رفع یدین نہیں ہونا چاہیے تو یہ اختلاف بُرا نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ یہ اختلاف جادۂ قویمہ کے خلاف نہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے یہاں اس کی مثالیں نہیں دی جا سکیں، لیکن شاہ صاحبؒ نے اس کی مثالیں دی ہیں کہ اس کے اندر رہتے ہوئے اختلافات وہ ہیں، جو صحابہؓ کے اندر بھی ہیں۔ ایسے اختلافات ٹھیک ہیں، لیکن اس سے باہر جو اختلافات ہیں کہ جادۂ قویمہ، کی رائے سے بالکل ہی سرے سے الگ ہو جائیں تو اصل میں انتشار اُس سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طریقے سے مثلاً سیاست ہے۔ کیا سیاست میں امن اور عدل پر ہمارا کوئی اختلاف ہے؟ کسی بھی سمجھ دار انسان کا کوئی اختلاف نہیں۔ عمل درآمد کے حوالے سے مختلف جزوی آرا ہو سکتی ہیں اور وہ ہونی بھی چاہئیں کہ اُسی سے چیزیں آگے بڑھتی ہیں۔ ایسے ہی معاشی حوالے سے بھی کچھ بنیادی امور پر ہمارا اتفاق ضروری ہے اور ہمارا معاملہ یہ ہے کہ کچھ علمی معاملات تو ہمارے پیشِ نظر ہوتے ہیں، لیکن سیاست، معیشت اور سماجیات، جیسے شعبے ایسے ہیں کہ بدقسمتی سے ہم اہلِ علم نے اس پر مکالمہ پورے طور پر نہیں کیا۔ اور ان کو موضوع بنا کر ان پر گفتگو نہیں کی۔ ہر آدمی نے انفرادی طور پر جو کچھ اس کا مطالعہ ہوا، اس مطالعے کے زور پر ایک کتاب لکھ دی اور ایک نیا مکتبہ فکر وجود میں آ گیا۔

اس پر بھی ہمیں گفتگو کرنی چاہیے کہ جو جادۂ قویمہ ہے، یعنی منطوقِ قرآن، احادیثِ مستفیضہ، کبار صحابہ کا اجماعی عمل، اور احادیثِ حسن اور صحیح کے تناظر میں ہمارا سیاسی مؤقف کیا ہونا چاہیے۔ اس کی عملی شکل کیا ہو؟ عملی شکلوں میں اختلافِ رائے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح معاشی حوالے سے صورتِ حال ہے۔ تو یہ علمی باتیں ہم شروع کریں گے تو بات آگے بڑھے گی۔ اگر یہ کہیں کہ ہم یہ علم پڑھے بغیر اس وقت سارے لوگوں کو متحد کر لیں تو میرا خیال ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔

سوال

میں نے کوشش کی درسِ نظامی پڑھنے کی، تین چار مدارس ہمارے ہاں درسِ نظامی پڑھا رہے ہیں۔ میں نے

بھی میں داخلہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ تم کلین شیو (clean shaved) ہو۔ تم مذہب کے معیار پر پورے نہیں اُترتے ہو۔ تمھیں ہم داخلہ نہیں دے سکتے۔ تم پہلے داڑھی بڑھاؤ، پھر تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنا۔ otherwise تم اس قابل نہیں ہو۔ میرے پاس ان کا جواب بھی لکھا ہوا پڑا ہوا ہے۔ تو جو ہم سکول و کالج میں پڑھنے والے لوگ ہیں، تو ہم دین کے لحاظ سے جاہل ہوتے ہیں۔ جو ہمارے مدرسوں کے پڑھنے والے لوگ ہوتے ہیں، انھیں انگریزی اور جو دوسرے عصری علوم ہیں، وہ انھیں نہیں آتے۔ وہ اپنے طرز پر قائم ہیں۔ تو ہم کوشش کر کے ان دونوں کو اگر ایک کر کے کوئی ایک ایسا نظام کیوں نہیں بنا پائے یا کیوں نہیں بنا سکتے کہ جس میں اگر میں گریجویشن کر کے نکلوں تو میں اپنے دینی معاملات کو بھی ہینڈل کر سکوں اور عصری معاملات میں بھی میں اپنے آپ کو آگے لے جا سکوں۔

جواب

ہم بھی آپ کے ساتھ متفق ہیں کہ یہ ہمارے معاشرے کی خرابیاں ہیں، جس میں ابھی تک ہمیں اہل علم ہونے کے باوجود علم اور جہل کا نہیں پتہ چلا۔ اور اس میں ہم کسی بھی شعبے کے عالم ہونے کے باوجود اس دوئی کے نظام سے نہیں نکلے۔ مسلمانوں کے غلبے کے زمانے میں اور پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے زمانے تک بھی ایسا رہا ہے کہ علم کا ایک ہی مرکز ہوتا تھا۔ اس علم کے مرکز سے علما بھی نکلتے تھے، صوفیا بھی نکلتے تھے، انجینئرز بھی نکلتے تھے، حکمران بھی پیدا ہوتے تھے۔ اور فزکس، کیمسٹری اور طبیعات کے ماہرین اور سوشیالوجی کے ماہرین بھی نکلتے تھے۔ یہ جو تقسیم ہے عصری اور دینی حوالے سے اور ان کے لیے جو خود ساختہ معیارات طالبِ علمی کے اور دوسرے شعبوں کے حوالے سے ہیں، یہ بھی ہماری غلامی کے زمانے کے ہیں کہ جب ہم دو سو سال غلام رہے یہاں انگریزوں کے اور خاص طور پر جب سے لارڈ میکالے نے آ کر یہ نظامِ تعلیم نئے خطوط پر استوار کیا، اس کے بعد سے اُس نے یہ عصری اور دینی تعلیم کی تقسیم کھڑی کی۔ اور پھر اس کی بنیاد پر ہی یہ سکولوں، کالجوں اور مدرسوں اور مسجدوں کا ایک خود ساختہ نظام بنا۔ جس کے آج کے غلامی کے ستر سال گزرنے کے باوجود بھی ہم اس تقسیم سے دوچار ہیں۔

ہمارے ادارہ رحیمیہ کا تو بنیادی پیغام ہی یہ ہے کہ یہ تقسیم ہمارے اندر سے ختم ہونی چاہیے۔ اور دیوبند کے سب سے بڑے فاضل شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، جو دیوبند کے پہلے طالبِ علم تھے، وہ سب سے پہلے خود علی گڑھ یونی ورسٹی آئے، حال آں کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی تھی، انگریزوں کے زیر اثر تھی، سر سید صاحب نے سیاسی طور پر انگریزوں کی حمایت کا اعلان بھی کیا تھا۔ دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان تضاد بھی تھا۔ 1919ء میں خود شیخ الہندؒ وہاں پہنچے اور حضرتؒ نے فرمایا کہ:

''میں جس غلبے اور آزادی کے لیے کام کرر ہا ہوں، اس کے غم خوار مجھے مدرسوں اور خانقاہوں میں کم ملے تو میں نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔'' انھوں نے ان دونوں چیزوں کی تفریق کو ختم کیا۔

بلکہ ہمارے پیرو مرشد حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ فرماتے تھے کہ یہ مسلمان نوجوان ہمارا اثاثہ ہے۔ سکول میں گیا ہے یا کالج میں گیا ہے، یا مدرسے میں ہے، اس کو علم کا بنیادی شعور ہونا چاہیے۔ وہ کسی بھی شعبے میں کام کرے۔ ظاہر ہے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ایک ڈاکٹر بہ یک وقت انجینئر بھی ہو اور بہ یک وقت مکمل عالم بھی ہو۔ یا جیسے کسی ایک عالم سے یہ تقاضا کرنا کہ وہ ایک وقت ڈاکٹر اور انجینئر بھی ہو، تو یہ بھی غیر منطقی بات ہے۔ لیکن کم از کم جو بنیادی سماجی علوم ہیں، ان پر تو سب متفق ہوں انسانی بنیادوں پر۔

یہ ضرور ہونا چاہیے اور اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس دورُخے نظامِ تعلیم سے ہٹ کر علم کے اساس پر پرکھیں اور انسانیت کی بلا تفریق رنگ، نسل، مذہب خدمت کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہوں۔

سوال

آپ نے بتایا کہ دارالعلوم دیو بند کے پہلے پچاس سال تک شاہ صاحبؒ کے نصاب کے مطابق تعلیم دی گئی۔ شاہ صاحبؒ کے نصاب میں اور آج کل کے نصاب میں کیا فرق ہے؟

جواب

اس کے لیے بس آپ ایک کام کریں کہ تاریخ دارالعلوم دیو بند جو حضرت قاری محمد طیب قاسمیؒ نے لکھوائی ہے، سیّد محبوب رضوی کی لکھی ہوئی ہے، اس میں وہ قدیم نصاب بھی موجود ہے اور جو آج کل آپ پڑھ رہے ہیں، آپ کے پاس بھی وہ نصاب موجود ہے، دونوں کا موازنہ کرلیں کہ کیا فرق ہے دونوں کے درمیان۔

سوال

برصغیر کی ایک خصوصیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ یہاں پر بہت سے مذاہب کے ماننے والے ہیں۔ ان کو آپس میں قریب لانا یا ان کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کاوشیں ہوتی رہی ہیں، جیسا کہ ہمارے ہاں اکبر بادشاہ نے بھی کوشش کی تھی ان کو قریب لانے کی۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ کا کیا طریقۂ کار ہے؟

جواب

شاہ صاحبؒ نے جب فلسفے پر بحث کی ہے، اس کے لیے ایک کتاب لکھی ہے، علم اسرارِ دین کو ثابت کرنے کے لیے، علما اور مسلمان اہل علم کو بات سمجھانے کے لیے حجۃ اللہ البالغہ لکھی۔ اور اسی علم وفکر کو انسانی اصولوں پر سمجھانے

کے لیے جس میں ویدانت فلاسفی، وحدت الوجود فلاسفی یا وحدت الشہود کے ماننے والے یا فلسفہ یونان سے جو لوگ شغف رکھنے والے ہیں، تو انسانی بنیادوں پر وہ کتاب شاہ صاحبؒ کی البدور البازغہ ہے۔ البدور البازغہ کے تین مقالے اور اس کا مقدمہ اس حوالے سے بڑی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس میں انھوں نے مذاہبِ عالم کے بنیادی تصورات اور ان کے مسلمات بیان کر کے اس کی روشنی میں انھیں سمجھایا ہے۔

سوال

آپ نے فرمایا کہ درسِ نظامی کا نصاب پہلے رائج تھا، بعد میں وہ نہیں رہا۔ اب نئے نصاب لانے کے حوالے سے دوبارہ بات ہو رہی ہے مدارس میں بھی اور کالجوں میں بھی۔ اگر نیا نصاب بنایا جائے تو اس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا کیا حصہ ہوگا۔

جواب

ہم نے تو آپ کے سامنے اس ولی اللّٰہی فکر کے نصاب کی پوری جامعیت اور اس کا ایک مربوط خاکہ رکھا ہے۔ فیصلہ سازی کرنے والے تو ظاہر ہے آپ کے مدارس کے وفاقات یا تنظیمات والے لوگ ہیں۔ یا حکومتی ادارے ہیں، جنھوں نے تعلیمی پالیسی بنانی ہے۔ وہ کس طرح اس کو قبول کرتے ہیں، یا قبول نہیں کرتے، اگر اُن کے اپنے کوئی تحفظات علمی طور پر ہوں تو بات کریں۔ اس پر تو ہم بات کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن انتظامی حکم نامہ تو ظاہر ہے جن کے قبضے میں انتظامات ہیں، انھوں نے کرنے ہیں۔

سوال

ہم درخواست کریں گے کہ ادارہ رحیمیہ سے کہ وہ کوئی ایسا نظام بنائے اور ہم جیسے گریجویٹس کو موقع دے، دینی تعلیم و تربیت کا کہ ہم یہ نصاب پڑھ سکیں۔

جواب

ہم تو یہ کام کر رہے ہیں اور ہمارے تو ان شاءاللہ دروازے کھلے ہیں۔

یہ نصاب میں آئیں، یہ کسی ادارے میں آئیں، یہ فکر و سوچ کے اندر آئیں تو پھر معاشرے کے اندر تبدیلی آئے گی۔ جو باتیں آزاد صاحب نے آج اپنے خطبے میں کہی ہیں، آپ اس کی عملی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اسی طرح، آزاد صاحب کا انداز بھی وہی تھا جو حضرت شاہ صاحب کا میں نے پڑھا۔ آپ نے بھی خود پڑھا ہوگا جو طلبا و طالبات یہاں بیٹھے ہیں، الفوز الکبیر تو پڑھی ہے سب نے۔ شاہ صاحبؒ کیا کہتے ہیں، جب کوئی مثال دیتے ہیں کہ آج اس کی تصویر آپ اپنے معاشرے میں دیکھ سکتے ہیں۔ آج فلاں طبقے کے اندر، میں نام نہیں لیتا، علمائے کرام بیٹھے ہیں، ناراض نہ ہو جائیں، تو آج فلاں طبقے کی تصویر یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ معاشیات کے حوالے سے، آج کے صنعت کار اور تاجر اور جو آج کے امرا طبقہ ہے، اس کے حالات آپ دیکھ سکتے ہیں۔

یعنی شاہ صاحبؒ نے جو فلسفہ علم دیا ہے، اس کو آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ان چار دنوں کے اندر۔ تو آپ لوگ خود بھی تشریف لائیں، اَوروں کو بھی لائیں، تو اس پر میں آپ سے یہ کہوں گا کہ جو طلبا و طالبات یہاں آئیں، وہ غور و فکر سے بیٹھیں۔ توجہ سے سنیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو علم اور فکر ہمیں دی، اور آج بھی ستر سال پاکستان بنے ہو گئے ہیں اور اس سے پہلے جیسے مفتی صاحب نے ابھی بتایا کہ ان سارے حالات کے اندر آج ہم وہیں کھڑے ہوئے ہیں، جہاں پر ہم پہلے تھے، شاہ صاحبؒ کی زندگی میں تھے۔ اور شاہ صاحبؒ نے تبدیلی کے لیے وہ نصاب، وہ فکر، وہ سوچ، وہ علم ہمیں دیا، آج ہم اس علم سے فائدہ حاصل کریں۔

آج بھی وہی انتشار ہے معاشرتی سطح پر، سیاسی سطح پر، سماجی سطح پر، معاشی سطح پر آپ دیکھ چکے ہیں جو آپ کے سامنے ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ معاشرے میں اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سماجی سطح پر ہر بچہ و بچی جانتا ہے کہ معاشرے میں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ علمی سطح پر ہمارا علم کتنا محدود ہے، یہ کلاس اور نوٹس کی حد تک ہے۔ تو پھر تبدیلی کیسے آئے گی؟ انتشار کا خاتمہ کیسے ہوگا؟ اور کھل کر بات کر رہے تھے مفتی صاحب ابھی کہ ہم علم کو بھی بیچتے ہیں، علم فروشی بھی کرتے ہیں، مذہب فروشی بھی کرتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ والے سارے کام آج ہم کر رہے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ ہماری حالت بدل جائے۔ ہم ایک اُمت بن جائیں۔ ہمیں غلبہ دین حاصل ہو جائے۔ یہ خواب تو کسی دیوانے کا ہو سکتا ہے، کسی عقل مند آدمی کا نہیں ہو سکتا۔

مفتی صاحب نے علم اور عمل کی جو بات کی ہے، اور ماشاء اللہ اتنی تفصیلی باتیں کی ہیں، تو کل بھی لیکچر ہوگا، پرسوں بھی لیکچر ہوگا، اس کے بعد بھی ہوگا۔ تو آپ سے میری

درخواست ہے کہ آپ جب چار دن بعد اس ہال سے اٹھ کر جائیں تو کم از کم آپ میں تبدیلی آنی چاہیے۔ علمی اور فکری طور پر آپ کی سمت درست ہونی چاہیے۔ آپ کے اندر انتشار کم ہونا چاہیے۔ آپ اس معاشی، سماجی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے آپ اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو کر جائیں۔ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم یہاں پر داخلہ لیتے ہیں، پڑھتے ہیں، ڈگریاں لیتے ہیں، لیکن وہیں کھڑے ہوتے ہیں، جہاں تھے۔

میرے عزیز طلبا و طالبات! آپ سے درخواست ہے، علمائے کرام اور اساتذۂ کرام سے بھی درخواست کرتا ہوتا ہوں کہ آپ اس معاشرے کی اساس ہیں۔ آپ اس کا ورثہ ہیں۔ اس کی بنیادیں ہیں۔ اور اسی پر عمارت تعمیر ہونی ہے۔ تو آپ تبدیلی کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیں۔ اور فکرِ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ آج آپ کے سارے مسائل کا حل دیتی ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور و فکر کرنا شروع کر دیں۔ اور اعتدال کے ساتھ اپنے معاشرے میں زندگی بسر کرنا شروع کر دیں۔ تو یہ جو انتشار ہے اور اس انتشار کی جو صورتِ حال ہے، عالمی طور پر بھی، قومی اور بین الاقوامی طور پر بھی، وہ دونوں ہمارے سامنے ہے کہ آج اسلام کو کیا چیلنجز درپیش ہیں۔ وہ آپ کے سامنے ہیں کہ آج انتشار بھی ہے، لیکن مذہبِ اسلام کو اس طرح سے بدنام کیا جا رہا ہے۔

ہم مل کر ان چار لیکچر سیریز کے اندر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فکر اور عمل کا جو علم ہے، اسے بھی حاصل کریں اور اس کے بعد بھی اس سے اپنا تعلق قائم رکھیں تاکہ ہمارے معاشرے کے اندر انتشار کم ہو سکے اور ہم اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکیں۔ ایسے سوالات جو آج معاشرے کے اندر ہو رہے ہیں، قومی طور پر بھی اور بین الاقوامی طور پر بھی، ان کا صحیح معنوں میں جواب دے سکیں۔

اس کے ساتھ میں جناب ڈاکٹر سعید الرحمٰن کا، موسیٰ پاک شہید چیئر کا بھی اور جو تمام لوگ باہر سے آئے ہیں، آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ شعبہ علومِ اسلامیہ کا یہ سٹیج، یہ ہال علم اور عمل کے لیے حاضر ہے۔ انشاء ایسے لیکچر اس کے بعد بھی ہوتے رہیں گے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دهلویؒ

فرماتے ہیں کہ آج کے زمانے کے ان حکمرانوں کو تم دیکھو تو قیصر و کسریٰ کو تم بھول جاؤ۔ وہی حالت ان لوگوں کی ہے۔ ان میں سے ایک ایک امیر آدمی ایک پٹکا بھی باندھتا ہے تو وہ بھی کئی کئی لاکھ روپے کا ہے۔ اور اگر کسی عیاشی کی مجلس میں جاتے ہیں تو وہاں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں کہ میرے پاس کتنا قیمتی جبہ ہے، میرے پاس کتنا قیمتی پٹکا ہے، کتنی قیمتی بڑی کلاہ (ٹوپی) لگا رکھی ہے۔ اس پر مقابلے ہوتے ہیں، مناظرے ہوتے ہیں۔ اور پھر اس پر جھگڑتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ کسی قوم میں اگر سبھی لوگ وسائل کو لوٹنے لگ جائیں تو اتنے وسائل کہاں سے آئیں گے؟ اس کے نتیجے میں ایک دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ جو کاشت کار، صنعت کار یا تاجر ہیں، تو ان کام کرنے والوں پر ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے بیان کیا کہ اصولِ مکاسب (بنیادی پیشے)؛ زراعت، تجارت اور صنعت ہیں۔ یہ تین ہی شعبے شاہ صاحبؒ نے بیان کیے ہیں، معاشیات کے ان تین بنیادی شعبوں میں کام کرنے والے جب یہ ظالمانہ ٹیکس ادا نہیں کر سکتے تو وہ مجبور ہو کر دو راستے اپناتے ہیں: یا تو وہ ردِّ عمل میں تشدد پسند بنتے ہیں۔ پھر حکمران طبقہ اُن کے قتل کے درپے ہوتا ہے۔ یا مجبوراً وہ ٹیکس دیتے ہیں تو اُن کی کارکردگی پر فرق پڑتا ہے اور وہ غریب سے غریب تر بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح قومی ریونیو (revenue) مسلسل گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''عیاشانہ زندگی بسر کرنے کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی، اس کا حصول بہت سی دولت خرچ کیے بغیر ناممکن تھا۔ اس لیے ان ملوک و سلاطین نے محنت کش طبقات یعنی کسانوں اور تاجروں وغیرہ پر بھاری ٹیکس لگا دیے۔ اگر وہ ٹیکس دینے سے انکار کرتے تو ان کو مارا پیٹا جاتا اور سخت عذاب دیا جاتا۔ اس طرح ان کے سامنے دوسرا راستہ ہی رہ گیا کہ وہ سلاطین اور سرمایہ داروں کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں۔ بیلوں اور گدھوں کی سی ذلیل زندگی بسر کریں۔ جن سے ان کی مرضی کے بغیر ہل چلانے، زمین کی کاشت، پیداوار اٹھانے اور کنویں سے پانی نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جن کی تھوڑی بہت پرورش یا غور و پرداخت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ مالکوں کی اپنے اغراض ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں''

دوسرا لیکچر

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ
کا نظریۂ اَسرارِ دین

مؤرخہ 18 / اپریل 2017ء بروز منگل

صدارت

پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالرحیم

چیئرمین شعبہ عربی، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

نظامت

پروفیسر ڈاکٹر جمیل احمد نتکانی

شعبہ علومِ اسلامیہ، زکریا یونیورسٹی، ملتان

تلاوتِ قرآن مجید

حافظ مسعود

ایم فل سکالر

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

محمد وسیم

ایم فل سکالر

دوسرا لیکچر

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اَسرارِ دین

نحمدهٗ و نصلّی علیٰ رسولهِ الکریم. اما بعد! فأعوذ بالله من الشّیطان الرّجیم. بسم الله الرّحمٰن الرّحیم. قال الله تبارک و تعالیٰ: "و من یؤت الحکمة فقد أوتی خیراً کثیراً. و ما یذکّر إلاّ اولو الألباب." (القرآن) و قال النّبیّ صلّی الله علیه و سلّم: "من یّرد الله به خیراً یفقّهه فی الدّین." صدق الله العظیم و صدق رسولهٗ النّبیّ الکریم.

گزشتہ لیکچر کا خلاصہ:

صاحبِ صدر اور معزز حاضرین!

کل سے ہم حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار کے حوالے سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کل حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت کے تعارف اور اُن کے علوم کے اجمالی تذکرے کے اختتام پر جو بنیادی باتیں ہمارے سامنے آئی تھیں، وہ یہ کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے دور کے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد فکری انتشار کو دور کرنے، سیاسی عدمِ استحکام کا خاتمہ کرنے اور معاشی طبقاتی نظام کے مقابلے پر ایک جامع دینی نظامِ فکر و عمل مرتب اور مدوّن کیا ہے۔ اس کے دو بنیادی پہلو کل ذکر کیے گئے تھے کہ ایک تو ایسے شاہ صاحبؒ نے علوم مرتب کیے، جو وحدتِ فکر پیدا کرنے والے تھے۔ اس سلسلے میں علوم القرآن میں شاہ صاحب نے پانچ نئے علوم متعارف کرائے۔ علوم الحدیث سے اخذ و استفادہ کا ایک واضح اور دوٹوک طریقۂ کار متعین کیا۔ صحابہؓ کی آرا اور اُن کے اجماع سے سوچ کو درست کرنے کا طریقۂ کار اور منہج واضح کیا۔ گویا کہ علومِ قرآنیہ سے استفادے کا ایک واضح الجادة القویمة یعنی شاہراہِ فکر و عمل متعین کی۔

اور دوسرا بنیادی کام یہ کیا کہ ایک مکمل اور جامع فلسفہ مرتب اور مدوّن کیا۔ کوئی بھی سوسائٹی اس وقت تک ترقی نہیں کرتی، جب تک کہ اس سوسائٹی میں بسنے والے لوگ جس علمی اور فکری بنیادوں پر اپنا سیاسی اور معاشی، سماجی

نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کے پیچھے ایک مربوط فلسفہ کارفرما ہو۔ فلسفہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی فلسفے کی اساس پر افکار مرتب ہوتے ہیں اور ان افکار کی روشنی میں سیاسی، معاشی اور سماجی نظام بنائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جہاں علومِ قرآنیہ کے ذریعے قرآن حکیم کے فہم یا دین کے فہم کا راستہ کھولا، وہیں دین کا بنیادی فلسفہ بھی مرتب اور مدوّن کیا۔ جسے خود شاہ صاحب علم اسرارِ دین کا عنوان دیا ہے۔ اور بعد میں آنے والوں نے اسی کو **فلسفة التشريع الإسلامي** کا نام دیا کہ دین اسلام کی جتنے بھی تشریعی پہلو ہیں، ان کی بنیادی فلاسفی کیا ہے؟ بنیادی نقطہ نظر کیا ہے؟

کل کی گفتگو میں ایک اَور بات بھی عرض کی گئی تھی کہ شاہ صاحبؒ نے علم تطبیق الآراء بھی مرتب اور مدوّن کیا ہے اور تطبیق الآرا کے ضمن میں یہ بات بھی عرض کی گئی تھی کہ تطبیق کا مطلب محض دو آرا کے درمیان کوئی ہم آہنگی پیدا کرنا ہی نہیں، بلکہ حقیقی اور واقعی صورتِ حال کا متعین کرنا اور پھر جو مختلف آرا کسی بھی پہلو سے یا کسی بھی مسئلے میں آرہی ہیں، ان آرا کے اس واقع یا حقیقت کے ساتھ انطباق میں اس کو مدنظر رکھنا کہ وہ کس حد تک اس واقع کے مطابق ہے یا اس واقعے سے منحرف ہے؟ انحراف کس درجے میں ہے؟ کون سی رائے کس درجے میں کس واقع کے عین مطابق ہے؟ ہم سب جانتے ہیں کہ جب کوئی خبر بیان کی جاتی ہے، اگر وہ واقع کے مطابق ہو تو اسے سچ کہا جاتا ہے اور اگر واقع کے مطابق نہ ہو تو وہی جھوٹ کہلاتی ہے۔ تو پہلے واقع کا تعین ہونا ضروری ہے کہ حقیقت اور واقعہ کیا ہے۔ اور پھر امام شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے تطبیق الآرا پر اپنی کتاب تکمیل الاذہان میں ایک مستقل باب قائم کر کے اس کے فنی امور مرتب اور مدوّن کیے ہیں، انھوں نے تطبیق کی حقیقت و ماہیت واضح کرتے ہوئے چند بنیادی اُمور کو متعین کیا ہے۔ وہ بنیادی اساسی امور سمجھنا ضروری ہیں، تاکہ حکمت اور فلسفے کے بنیادی و اساسی امور واضح ہو سکیں۔

فلسفہ کی تعین کی ضرورت

فلسفے کے تعین کی ضرورت یوں بھی پیش آئی کہ فلسفے کے بہت سے مکاتبِ فکر موجود رہے۔ فلسفہ یونان جو مشائین کہلانے والے یا مادی نقطہ نظر سے کائنات کا مطالعہ کرنے والوں نے مرتب اور مدوّن کیا۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ''عقولِ عشرہ'' کی بنیاد پر اُن کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ دوسری طرف فلسفے کا ایک اَور مکتبِ فکر جسے اشراقیین کہا جاتا ہے۔ وہ بھی رہا ہے۔ ایسے ہی فلسفے کے تعین میں یا علم الکلام کے تناظر میں وہ محققین بھی رہے ہیں، جنھیں متکلمین کہا جاتا ہے۔

فلسفے کے کم از کم یہ تین سکول رہے ہیں۔ اور پھر انھیں سے متاثر ہو کر ایک اَور سکول جسے متأخرین صوفیا کا نقطہ نظر کہنا چاہیے، وہ بھی رہا ہے۔ جس میں موجود فلسفے کی اور کچھ دینی اُمور کی امیزش کے ساتھ انھوں نے اپنے ایک فلسفے کا تعین کیا ہے۔ اور اگر ہم دین کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو محدثینؒ وفقہاء، مجتہدین کی آراء بھی ہیں۔ تو ان تمام کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے بنیادی بات امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم کے دو بڑے شارحین نے کی، جن میں ایک تو

اُن کے اپنے صاحبزادے شاہ رفیع الدین دہلویؒ ہیں اور دوسرے شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ ہیں۔ شاہ صاحب کے فلسفے کی تشریح میں شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں ''دمغ الباطل'' بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اسی طریقے سے **تکمیل الاذھان** لاجواب کتاب ہے۔ **اسرار المحبۃ** ان کی تیسری کتاب ہے، جس میں انھوں نے اس حوالے سے بہت سے بنیادی امور واضح کیے ہیں۔ اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ کے بعد حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے ''عبقات'' لکھی، جس میں شاہ صاحبؒ کے فلسفے کے بہت سے امور کو عقلی بنیادوں پر واضح کیا۔

علم کے تین بنیادی ذرائع

ان دونوں حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے اور دلائل سے انھوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ علم کے بنیادی ذرائع تین ہوتے ہیں: عقل، نقل اور کشف و وجدان۔ عقل کے ذریعے سے تجربات اور مشاہدات کیے جاتے ہیں اور اس سے جو نتائج سامنے آتے ہیں، وہ عقلی نتائج فکر کہلاتے ہیں۔ تجرباتی اور مشاہداتی نتائج فکر سے جو علم وجود میں آتا ہے، وہ عقلی علم کہلاتا ہے۔ دوسرا نقل کہ جو کسی نبی سے یا کسی اولوالعزم او نچے درجے کے حکیم سے کوئی بات نقل در نقل کتابوں میں یا راویوں کے ذریعے سے آپ تک پہنچی ہے۔ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کے حاملین انبیا ہوں یا وہ حکما اور عقلا ہوں، جن کو کسی بھی واسطے سے، کسی بھی ذریعے سے علم حاصل ہوتا ہے۔ اور یقیناً وہ ذریعہ شاہ صاحبؒ کے نقطہ نظر کے مطابق جہاں تک اُن کی اپنی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہوتا ہے، انھیں کی روشنی میں ان حکما پر بھی کچھ چیزیں وارد ہوتی ہیں، جو بعد میں نقل در نقل، روایت در روایت ہوتی ہیں۔ انسان ان سے استفادہ کرتا ہے۔ تیسری اور اہم ترین چیز کشف کہ انسان پر علم کا انکشاف ہوتا ہے۔ جب کہ کوئی علمی ماہر کسی خاص شعبے پر مخصوص توجہ دیتا ہے۔ اس کے علوم وافکار، قاعدوں ضابطوں اور علمی تقاضوں پر یکسو ہو کر غور و فکر کرتا ہے۔ کسی نتیجے پر بہ ظاہر اس کا دماغ نہیں پہنچ رہا ہوتا ہے تو ایک انکشاف کی یا کشف کی حالت اس پر طاری ہوتی ہے۔ خواہ کسی شعبے کا بھی ہو کہ اچانک ایک خیال کا کوندا اس کے دماغ میں لپکتا ہے اور اس کا جو عقدہ ہے، یا جو مشکل ہے، وہ فوراً حل ہو جاتی ہے۔

اب چاہے صوفیا یا اولیا کا کشف ہو یا محققین حکما کا کشف ہو۔ اس کشف کی شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سات اقسام بیان کی ہیں اپنی کتاب سطعات میں۔ جس کی سب سے پہلی اور بنیادی شکل خواب ہے کہ انسان خواب میں بعض ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے، جو کچھ عرصے بعد اس کے سامنے حقیقت بن کر آجاتی ہیں۔ تو مستقبل کا کوئی معاملہ اس کے سامنے منکشف ہو گیا خواب کی شکل میں۔ یا ایک آدمی کی چھٹی حس ہے، اس کی کئی اقسام ہیں۔ کشف کی جامع ترین قسم وحی الٰہی ہے جیسے غارِ حرا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر براہِ راست فرشتے کی آمد کے ذریعے سے دوٹوک اور قطعی انداز میں پہنچی تو یہ وحی الٰہی کشف کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ تو علم کے تین ذرائع ہیں۔

شاہ صاحب کی علمی جامعیت

شاہ رفیع الدین دہلویؒ لکھتے ہیں: جہاں تک عقل کا معاملہ ہے، اس ذریعہ علم کو صرف ایک طبقے، یعنی حکمائے مشائین نے اختیار کیا ہے۔ جہاں تک نقل کا معاملہ ہے، اسے صرف محدثین نے پیش نظر رکھا ہے۔ جہاں تک کشف کا معاملہ ہے، متاخرین صوفیا یعنی بعد میں آنے والے جو صوفیا ہیں، عام روایتی یا رسمی، انھوں نے کشف کو ہی سب کچھ ذریعہ بنالیا اور باقی دو کو پیش نظر نہیں رکھا۔ متکلمین نے عقل اور نقل ان دونوں چیزوں کو پیش نظر رکھا اور کشف کو سرے سے چھوڑ دیا۔ اشراقیین نے کشف اور عقل ان دونوں کو ملایا مگر شریعت اور نقل کو چھوڑ دیا۔ گویا کہ جتنے بھی طبقات فلاسفہ کے ہیں یا فلسفی لوگ جتنی بھی آرا قائم کرتے رہے ہیں۔ وہ یا مشائین ہیں یا اشراقیین ہیں۔ یا متاخرین صوفیا ہیں یا متکلمین ہیں۔ یا صرف روایات جمع کرنے والے محدثین ہیں۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو ان تینوں علوم کے جامع ہیں، وہ بہت کم انسانی تاریخ میں رہے ہیں۔ اور ان میں اس دور کا سب سے بڑا نمایاں نام، افضل المحققین حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ہے۔ پھر ایک اور حقیقت بھی واضح کی کہ یہ تینوں ذرائع علم کسی واقع کے تعین میں متفق ہونے چاہئیں کہ واقعہ یہی ہے، کیوں کہ حقیقت، کائنات کے اندر ایک ہے۔ جب کائنات ایک ہے، حقیقت ایک ہے اور اس کے علم کے یہ ذرائع ہیں تو ان تینوں کا متفق ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی مسئلے میں تینوں کی آرا ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ذرائع علم میں سے کوئی نہ کوئی ذریعہ علم ناقص اور ادھورا ہے۔ اس نے ٹھیک طریقے سے چیز کا مطالعہ نہیں کیا۔ جب کائنات کی چیزیں ایک ہیں تو کشف صحیح، عقل صحیح اور نقل صحیح متفق ہوں گے۔ اور اگر اتفاق نہیں پایا جاتا تو اس کا مطلب ہے کہ ان تینوں ذرائع علم میں سے کہیں نہ کہیں کسی جگہ کوئی نقص ہے کہ صحیح طور پر واقعے کے تعین کرنے میں اُن سے غلطی ہوئی ہے۔ تو ان تینوں ذرائع علم کا اتفاق ہونا ضروری ہے۔

شاہ صاحب اور علم اسرار دین

شاہ ولی اللہ صاحب نے جو علم اسرارِ دین مرتب اور مدوّن کیا ہے، اس میں ان تینوں ذرائع علم سے حقائق متعین کیے۔ یہ بڑا بنیادی کام ہے۔ اس لیے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے کہ جو انھوں نے **حجۃ اللہ البالغہ** کے مقدمے میں کیا ہے کہ یہ علم جو میں نے یہاں مرتب اور مدوّن کیا ہے پچھلے ہزار سال میں کسی نے اس طریقۂ کار پر متعین نہیں کیا۔ یقیناً جزئیات یا فروعات رہی ہیں اور کچھ لوگوں نے کچھ فائدے بیان ضرور کیے ہیں، جیسے علامہ خطابی ہیں، جنھوں نے **سنن ابو داؤد** کی شرح **معالم السنن** لکھی۔ یا شیخ عزالدین ابن عبدالسلام نے **قواعد الاحکام فی مصالح الانام** لکھی ہے۔ شاہ صاحب نے **الجزء اللّطیف** میں یہ بات واضح کی ہے کہ اللہ نے میرا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا۔ اور ایک اور بات بھی شاہ صاحب نے کی کہ دیکھو ہر ایک زمانے کا ایک علم

ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جس زمانے میں جس علم کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے افراد پر وہ علوم نازل کرتا ہے۔ میرا یہ زمانہ ان تینوں کے جامع ذرائع علم کے استعمال کا زمانہ ہے۔ خاص طور پر حکمتِ عملی کے تناظر میں عقل، نقل اور کشف کی جامعیت کا زمانہ ہے کہ اللہ نے اس کام کے لیے مجھے منتخب کرلیا۔

شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں التفہیماتِ الالٰھیہ میں "علمنی ربی الحکمة العملية" (میرے ربّ نے مجھے حکمتِ عملیہ عطا فرمائی) اس دور کی درستگی کا اصل منتہی اور مقصود اسی حکمتِ عملیہ پر مبنی ہے۔ اس دور میں کامیابی اس حکمتِ عملی کو اختیار کیے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اور پھر اگلی بات بھی ارشاد فرمائی کہ وفقنی بتشییدها بالكتاب و السنة و بآثار الصحابة کہ مجھے اللہ نے توفیق دی ہے کہ میں اس حکمتِ عملی کو کتاب وسنت اور آثارِ صحابہؓ کی روشنی میں مضبوط اور مستحکم عقلی بنیادوں پر اس کا ایک مربوط فلسفہ بنادوں۔

جیسا کہ کل بھی ذکر کیا گیا تھا کہ مجدد کی حیثیت سے علم الجمع بين المختلفات ، یعنی مختلف پہلوؤں یا مختلف علوم کے درمیان جمع کرنے کی اہلیت وصلاحیت اس دور کے مجدد امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اور یہ جمع بین المختلفات یا تمام علوم کے تناظر میں واقعات کا تعین، یہ بڑی بنیادی حقیقت ہے کہ یہی مشکل امر ہے، تاکہ یہ اختلاف اور انتشار کی کیفیت ختم ہو اور وحدتِ فکری پیدا ہو۔ اس کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یہ کتاب لکھی "حجۃ اللہ البالغہ"۔ کتاب کا جو بنیادی علم ہے، وہ علم اسرارِ دین ہے۔

علم اسرار دین کی تعریف

علم اسرارِ دین پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلی ضرورت تو ہمارے سامنے یہ آنی چاہیے کہ خود علم اسرارِ دین کی تعریف کیا ہے؟ جب تک کسی علم کی تعریف، اس کا موضوع، اس کی غرض وغایت، اس کی افادیت اور اہمیت سامنے نہ ہو تو دراصل اس علم کا اجمالی خاکہ بھی ذہن میں نہیں آتا۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمے میں علم اسرارِ دین کی تعریف کی ہے کہ یہ وہ علم ہے، جس کا موضوع بحث ہے:

حِكَم الأسرار و لمّياتها و اسرار خواص الأعمال و نكاتها.

کہ یہ ایک ایسا علم ہے، جس میں انسانی سوسائٹی میں جو قانون یا حکم جاری کیا گیا ہے، اس حکم کی حکمت اور اس کے دلائل سمجھنا کہ یہ حکم کس مصلحت کے تحت جاری کیا گیا؟ کیا مقاصد واہداف ہیں اس حکم کو جاری کرنے کے؟ چونکہ معاشرہ ترقی کرتا ہے قانون کی پابندی سے۔ اور ہر قانون کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور کچھ کاموں سے روکتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی ملت ومذہب یا کسی بھی سکول آف تھاٹ پر قائم ہو، وہ کچھ باتوں کے کرنے کا حکم (امر) دیتا ہے اور کچھ چیزوں سے وہ روکتا ہے، (نہی) یعنی کوئی حکم، قانونی نظام یا آرڈر پاس کیا جاتا ہے۔ خواہ جج جاری کرے، قاضی جاری کرے، ملک کا وزیراعظم یا پارلیمنٹ جاری کرے۔ اس حکم کی حکمت کیا ہے؟ اس کی مصلحت

کیا ہے؟ اور اسی کے ساتھ ساتھ اس حکم کے دلائل کیا ہیں؟ کیوں یہ حکم سوسائٹی پر نافذ کیا گیا ہے؟

حِکم الأحکام و لمیاتھا، پہلا دائرہ ہے۔ اور یہ حکم کی حکمتیں اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتیں، یا اس پراسیس (process) کو اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا، جب تک کہ اسرار **خواص الاعمال و نکاتھا** کا علم نہ ہو۔ انسان صبح سے شام تک عمل کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں، اس کا جسم، اس کے اعضا حرکت میں رہتے ہیں اور اعمال صادر ہوتے ہیں۔ تو یہ اعمال خود کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ ان کے کیا خواص اور اثرات وتاثیرات ہیں؟ ایک عمل کا کیا اثر اور نتیجہ نکلے گا؟ اس دنیا میں بھی یا موت کے بعد انسانی نفس میں اس عمل کی حفاظت یا محفوظ رہنے سے کیا نتیجہ نکلے گا؟ ہم اعمال کی تہذیب وترتیب کے لیے قوانین کیوں بناتے ہیں؟ تو ان اعمال کی حکمتیں سمجھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمیں پہلے یہ تو معلوم ہو کہ عمل کی قدر وقیمت کیا ہے؟ خود عمل کیا ہے؟ عمل کی خاصیت یا تاثیر کیا ہے؟ اچھی یا بُری؟ نیکی یا بدی؟ صحیح یا غلط؟ اس کے خواص معلوم ہونے چاہئیں۔ جس عمل کو روکا گیا ہے، کیا اس کی تاثیر غلط تھی، اس لیے روکا گیا ہے؟ وہ غلط تھی تو کیوں؟ یہ بنیادی سوال ہے کہ اعمال کے خواص، اس کی تاثیرات کے اسرار کے ضمن میں ہر عمل کا کیا اثر اور کیا نتیجہ ہے؟

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بڑے دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کی ہے کہ کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں، اللہ نے تخلیق کے وقت اس میں ہر چیز کے اندر ایک خاص خاصیت رکھی ہے اور وہ قیامت تک رہے گی۔ آگ جلانے کا کام کرتی ہے، قیامت تک جلائے گی۔ پانی بہاؤ رکھتا ہے، وہ بہاؤ اس کی خاصیت ہے۔ آکسیجن، ہائیڈروجن وغیرہ وغیرہ جتنے بھی عناصر ہیں، ہر ایک اپنی خاصیت رکھتے ہیں۔ تو عمل کی بھی ایک خاصیت ہے۔ تو عمل کی خاصیت معلوم کرنا، اس کے اَسرار معلوم کرنا، اس کے جو پہلو ہیں، گہرائی میں جا کر کیا کیا اس کے اثرات ونتائج اور اس سے متعلق کون کون سے بنیادی نکات ہیں؟ انھیں جاننا اس علم کا تقاضا ہے۔

علم اسرار دین کا موضوع

ہم جانتے ہیں کہ کسی علم میں جس چیز کے لوازمِ ذاتیہ (essential requisites) سے بحث کی جاتی ہے، وہی اس کا موضوع ہوتا ہے۔ تو علم اسرارِ دین کا موضوع دو دائروں میں ہے: احکام اور اعمال۔ انسانی اعمال کی لوازمِ ذاتیہ کیا ہیں؟ اس کے خواص اور اس کے اسرار کیا ہیں؟ اس کے بنیادی نکات کیا ہیں؟ اور اسی طریقے سے جو حکم جاری کیا گیا ہے، تو ہم اس کو کہیں گے کہ یہ واقع کے مطابق ہے یا واقع سے ہٹا ہوا ہے تاکہ جب حکم کی حکمت معلوم ہو تو خود حکم کی حقیقت وماہیت ہمارے سامنے آئے۔

علم اسرار دین کی اہمیت

اس تناظر میں علم اسرارِ دین انسان کے اندر جو فائدے دیتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے

مقدمے میں بیان کیا ہے، وہ تین فائدے ہیں کہ اس سے انسان صاحبِ بصیرت بن جاتا ہے۔ اور اس کی ایک مثال دے کر بتلایا کہ شاعر لوگ جن پر ملکۂ شعر غالب آجاتا ہے تو وہ دیگر لوگوں کے شعر کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کون سا شعر، قوانین اور ضابطوں کے مطابق ہے اور کون سا نہیں۔ ایک فقیہ، جزئیات کا جائزہ لے کر فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی جزئی فقہ کے ضابطے کے مطابق درست ہے، الغرض جس علم کا جو ملکہ انسان میں پیدا ہوگیا تو گویا اس میں بصیرت پیدا ہوگئی کہ اس کے ذریعے وہ فرق وامتیاز پیدا کر سکتا ہے صحیح اور غلط میں۔ ایسے ہی انسان کے اندر شریعت کے جو احکاماتِ الٰہیہ ہیں، اللہ نے جو جاری کیے ہیں، انبیا کی طرف سے جو شریعت آئی ہے یا جو بھی شریعت یا قانون کسی سوسائٹی میں آپ لا رہے ہیں، اس میں صحیح اور غلط میں فرق وامتیاز پیدا کرنے کی بصیرت اور شعور پیدا ہوتا ہے۔

اور جب یہ انسان میں شعور اور بصیرت پیدا ہوتا ہے تو پھر دوسرا مرحلہ یہ بھی ہے کہ وہ کہیں بڑی غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا اور غلطیوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ جیسے بھینگی اونٹنی پر کوئی سفر شروع کر دے، جسے سامنے سے ایک کے بجائے دو نظر آرہا ہے تو وہ مسافر کو منزلِ مقصود تک کیسے پہنچائے گی؟ تو جیسے وہ سوار کامیاب نہیں ہو سکتا، ایسے ہی جس کے پاس علم بصیرت نہیں ہے، تو وہ بھی ایسے ہی ہے جیسے بھینگی اونٹنی پر بیٹھا ہوا ہے۔ یا حاطب اللیل کی مثال دی ہے کہ لکڑیاں جمع کرنے کے لیے بھیجا جائے رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تو وہ سب رطب و یابس، خشک اور گیلی سب لکڑیاں اس نے جمع کیں جس میں سانپ بچھو بھی آگئے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ روشنی ہو تو پتہ چل جائے کہ کون سی لکڑی قابلِ استعمال ہے، جس سے آگ جلائی جا سکتی ہے، کون سی نہیں۔ تو اس علم سے ایسی روشنی اور بصیرت آتی ہے کہ جس سے جو اندھیرے ہیں، وہ چھٹ جاتے ہیں اور غلطی کا ارتکاب کرنے سے انسان بچ جاتا ہے۔

اور اس علم سے جو تیسرا فائدہ شاہ صاحب نے بیان کیا، وہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ کی شریعت پر انسان کو پختہ یقین علیٰ وجہ البصیرت اور دلائل کے ساتھ حاصل ہوتا ہے۔ اس کو قرآن نے کہا ہے کہ جو آدمی مسلمان ہوتا ہے، وہ علیٰ بینۃ من ربہ (اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل اور کھلی نشانی کی بنیاد پر) ایمان رکھتا ہے۔ ایمان کی کیفیت علیٰ وجہ البصیرت ہوتی ہے۔ محض تقلیدی ایمان نہیں ہوتا۔ یہ کم از کم تین بنیادی فائدے اس کے ہیں۔

بِرّ و اِثم کی بحث

علم اسرارِ دین کی تعریف، موضوع اور غرض و غایت کے بعد اس علم اسرارِ دین کا ایک اجمالی خاکہ بھی شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب کے مقدمے میں واضح کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دیکھیے! میں نے جب دنیا بھر کی تمام شریعتوں، قوانین اور دنیا بھر کی تمام ملتوں کے قانونی، سیاسی، سماجی، معاشی نظاموں کا جائزہ لیا تو میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ان تمام کی بنیاد دو باتیں ہیں۔ تمام شریعتوں کے راز اور اُن کی بنیادی حقیقت دو پہلوؤں میں بند ہے۔ نمبر ایک یہ کہ دنیا کا ہر

قانون سب سے پہلے یہ بحث کرتا ہے کہ کون سی چیز اُس کے نقطہ نظر سے نیکی یا البر اور اچھائی ہے؟ اور کون سی چیز برائی یا الاثم ہے؟ ہمیشہ ہر قانون جب بھی کسی معاشرے میں قائم کیا جاتا ہے یا کوئی بھی مذہب انسانی معاشرے میں قانونی نظام بناتا ہے تو وہ جو اس کے خیال میں نیکی یا اچھائی ہوتی ہے، اس کو عمل میں لانے کے احکامات جاری کرتا ہے۔ امر (حکم) انھیں باتوں کا ہوتا ہے، جو اس کے مقاصد کے مطابق ہو۔ اور جو اس کے خیال میں بُرا ہوتا ہے، اُسے الاثم یا بُرائی کہا جاتا ہے، اور وہ اس بُرائی کو روکتا ہے۔ دنیا کا ہر قانون حکم بھی دیتا ہے اور کچھ چیزوں سے روکتا بھی ہے۔ روکتا اُن تمام چیزوں سے ہے، جو اُس کے نقطہ نظر سے بُرے ہیں۔ اور اچھائی جو اس کے نقطہ نظر سے ہے، اس کا وہ حکم جاری کرتا ہے۔ اور یہ بحث اس لیے ضروری ہے کہ ہر مذہب، ہر سکول آف تھاٹ، ہر فلسفہ وفکر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے جس چیز کا حکم دیا ہے، نیکی صرف وہی ہے۔ اور میں جس چیز سے روک رہا ہوں، بدی وہی ہے۔ اگر بات یہی ہوتی اور انسانوں کے فائدے کے لیے نظام بنایا جانا ہے تو پھر اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ اختلاف کیوں؟ لہٰذا ہر اختلاف کے حل کرنے کے لیے نیکی کے معیارات طے کرنے ہیں۔ پہلے ''واقع'' تلاش کرنا ہوگا کہ واقعیت کیا ہے؟ تاکہ متعین کیا جائے کہ اس کے لیے واقعتاً یہ چیز اچھی اور مفید ہے تو اس کا حکم دیا جائے۔ اور پھر واقع کے تعین سے ہی پتہ چلے گا کہ فلاں چیز اس کے لیے مضر ہے، اس کو روک دینا چاہیے۔ کیوں کہ ہدف حضرت انسان ہے۔ انسانیت کے لیے جو مفید ہوگا، وہ البر (نیکی) اور جو انسانیت کے لیے مضر ہوگا، وہ الاثم (برائی)۔ تو پہلی بحث البر و الاثم کی ہے۔

اجتماعی سیاست کی بحث

دوسری بحث یہ ہے کہ جب کوئی بھی قانون اور ضابطہ یہ طے کر لیتا ہے کہ یہ چیز اچھی ہے، سوسائٹی میں اس کا فروغ ہونا چاہیے۔ اور یہ چیز بُری ہے، اس کو سوسائٹی سے روک دینا چاہیے۔ یعنی ایک چیز معروف ہے اور دوسری چیز منکر۔ تو ان معروفات اور منکرات یا اوامر اور نواہی یا اچھائی اور بدی، اس کے قیام یا انسداد کا ایک پریکٹیکل سسٹم قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے عنوان استعمال کیا ہے ''**مبحث السیاسة الملیه**'' یعنی ملت اور قانون کا سیاسی نظام۔ سیاسی نظام قائم کیے بغیر کوئی نیکی اور بدی اپنا وجود نہیں رکھتی۔ وہ اَخلاقی وعظ ہوگا کہ جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔ جب نیکی اور بدی کا تعین ہوگیا تو نیکی اور بدی کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک سیاسی سسٹم کی ضرورت ہے۔

سیاست کہتے ہی اس کو ہیں کہ نقص سے نکال کر کمال تک پہنچانا اور کمزوریوں کو دور کر کے ترقی کی طرف لے جانا، یہی لفظِ سیاست کا مطلب ہے۔ آج ہمارے ہاں تو لفظِ سیاست بدنام ہوگیا۔ جھوٹ بولنے، دھوکا دینے کو ہم کہتے ہیں کہ یہ سیاسی بات ہے۔ یہ سیاسی وعدہ تھا حالاں کہ یہ سیاست نہیں ہے۔ سیاستِ نبویہ یا سیاستِ حقیقیہ دراصل کہتے ہی اس کو ہیں کہ وہ دراصل نقص سے نکال کر کمال تک پہنچانے کا عمل ہے۔ تو اس کا عملی نظام بنایا جائے۔ جو اصول آپ

نے نیکی اور بدی کے متعین کر لیے، اس کی روشنی میں آپ کو کچھ پالیسیاں بنانی ہوں گی۔ اس کے پروسیجر بنانے ہوں گے۔ عمل درآمد کی حکمتِ عملی اور طریقۂ کار بتلانا ہوگا کہ کون سا کام کس وقت پر کس طریقے، کس منہج اور کس نظم کے تحت کیا جانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ نیکی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اور جو بدی ختم کرنی ہے تو اس بدی کو ختم کرنے کا بھی ایک پروسیجر ہوگا۔ ایک طریقۂ کار ہوگا۔ یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے، اپنے خیال کے مطابق کسی چیز کو بدی سمجھے اور اس بدی کو مٹانے کے لیے ازخود ہی تلوار سے وار کرنا شروع کر دے کہ میں بدی مٹا رہا ہوں۔ اس کا بھی ایک پروسیجر اور طریقۂ کار ہے۔

الغرض شاہ صاحبؒ نے علم اسرارِ دین کا بنیادی خاکہ بتلاتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کیا کہ ہر قانون اور شریعت میں ایک بحث ہے نیکی اور بدی کی۔ جس کو متعین کرنا ضروری ہے۔ اور دوسری بحث ہے جو نیکی ہے اس کو غالب کرنے اور جو بدی ہے، اس کو ختم یا مغلوب کرنے کا سیاسی نظام بنانا۔

جزا و سزا کی بحث

شاہ صاحبؒ نے اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ جب ہم نیکی اور بدی کو واضح کریں گے تو ہر دنیا کا مذہب یا ہر وہ فرد جو یہ کہے گا کہ ہم نے جس چیز کو اپنے علم کے راستے سے درست سمجھا ہے، وہی واقع ہے اور وہی درست ہے۔ تو اس کا فیصلہ کیسے ہوگا؟ حقائق کے تناظر میں واقعتاً کون سی نیکی ہے اور کون سی بدی ہے؟ تو شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس کے لیے کم از کم تین بحثیں کرنا ضروری ہے۔ ایک بحث تو اس حوالے سے ہے کہ انسانی اعمال کی جزا یا سزا کو اچھائی یا بُرائی کے تناظر میں جاننا ضروری ہے۔ کیوں کہ جس عمل سے روکا گیا ہے، اس عمل کی سزا کیا تھی؟ کس وجہ سے روکا گیا؟ تو پہلے اس سزا یا عمل کے درمیان جو تعلق ہے، اس تعلق کو سمجھا جانا ضروری ہے۔ ایسے ہی یہ بھی سمجھا جانا ضروری ہے کہ جس عمل کے بارے میں ہم کہہ رہے ہیں کہ یہ عمل درست ہے اور نیک ہے اور اس کے اچھے نتائج نکلیں گے، تو اس عمل اور اس کے نتیجہ کے درمیان بحث کیا جانا ضروری ہے کہ یہ دونوں آپس میں کس حوالے سے مربوط ہیں کہ ہم نے اس کو نیکی قرار دیا ہے۔ گویا مجازات کا قانون جاننا ضروری ہے۔

نوعِ انسانی کی سعادت کی بحث

دوسری ایک اور اہم ترین حقیقت جاننا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ نوعِ انسانی کی کامیابی کا معیار کیا ہے؟ کیوں کہ تمام قوانین اور شریعتوں کا بنیادی ہدف انسانی سعادت یا کامیابی ہے کہ انسانیت ترقی کرے۔ دنیا میں بھی ترقی کرے اور جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں، وہ آخرت کی ترقی کا بھی نقطہ نظر رکھیں۔ خود انسان کی کامیابی کیا ہے؟ کامیابی کی حقیقی اور واقعی تعریف کیا ہے؟ کہ جس کی اساس پر ہم سمجھیں کہ یہ کامیابی کا ہدف ہے۔ اس ہدف کے حصول کے لیے یہ امر نیکی ہے اور اس ہدف کے حصول میں یہ بُرائی رُکاوٹ ہے۔ اس لیے اس بُرائی کو روکا جانا چاہیے۔ تو پہلے

کامیابی کا ہدف تو متعین کیجیے کہ انسان کا بنیادی ہدف کامیابی اور نیکی کا کیا ہے؟

ارتفاقات اور حقیقت انسانیت

اور تیسری بحث یہ ہے کہ یہ انسان جسم کا، گوشت پوست کا چلتا پھرتا ایک حیوان بھی ہے۔ اس میں حیوانی تقاضے بھی ہیں۔ اس کو اپنے جسم کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ایک سیاسی و معاشی سسٹم کی ضرورت ہے۔ یہ جو سماجی ارتقا انسانیت میں اوّل سے لے کر اب تک ہوا ہے، اور انسانی سہولتوں کا نظام وجود میں آیا ہے، اس کی بحث کرنا بھی ضروری ہے۔ جس کو شاہ صاحبؒ نے ارتفاقات سے تعبیر کیا کہ ارتفاقات، کا مطلب ہے انسانوں کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا اور سہولتوں کا وجود پذیر ہونا (اس موضوع پر اگلے لیکچر میں بات ہوگی) تو تین بحثیں ضروری ہیں کہ جزا و سزا کا نظام کیا ہے؟ نوعِ انسانی کی سعادت کیا ہے؟ ارتفاقات کیا ہے؟

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ واضح کرتے ہیں کہ انسانی کامیابی کا معیار طے کرنا، انسانی جسم کے ارتفاقات کو زیرِ بحث لانا اور اعمال کی جزا و سزا کا ربط اس وقت تک حقیقی طور پر معلوم نہیں ہوگا جب تک کہ اس کائنات کی جو بنیادی حقیقت ہے، وہ سامنے نہ آئے کہ کائنات کیا ہے۔ اور اس کائنات میں انسان کیا ہے؟ اور کون ہے؟ تو انسانیت کی تعریف، انسانیت کی حقیقت پہلے معلوم ہو۔ اس کے بنیادی اساسی اصول واضح ہوں کہ انسان کیا ہے اور اس کی کیا کیا ضرورتیں ہیں؟ ان ضرورتوں کی تکمیل کریں گے تو سعادت ہے۔ اور اگر اس کی تکمیل نہیں کریں گے تو یہ شقاوت ہے، یا اس کے لیے بُرا ہے۔ تو انسان کی حقیقت معلوم ہونے سے ہی باقی امور ہمارے سامنے آجائیں گے۔

ارتفاقات یا سیاست اور معیشت کے معیارات تبھی متعین ہوں گے کہ خود حضرت انسان کو معلوم ہو کہ اس کی اپنی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کی ترتیب کے لیے کونسے ارتفاقات چاہئیں اور اس کی اُخروی کامیابی کے لیے کیا مطلوبہ اَخلاق چاہئیں۔ اور تبھی ہم اعمال اور ان کی جزا وسزا کے درمیان ربط (link) ہے، وہ صحیح طور پر تلاش کر پائیں گے۔ یہ چار بحثیں پہلے ہوں گی تو پھر پانچویں بحث ''مبحث البر و الاثم'' یعنی نیکی اور بدی کا صحیح معیاری نظام طے ہوگا اور جب نیکی بدی کی حقیقت واضح ہوگی تو پھر عملی سیاسی، سماجی اور معاشی نظام قائم کرنے کی چھٹی بحث ''مبحث السیاسة الملیه'' کی بات ہوگی۔

حجۃ اللہ البالغہ میں دو اقسام ہیں: پہلی قسم سات مباحث پر مشتمل ہے۔ چھ تو مذکورہ بنیادی مباحث ہیں اور ساتویں مبحث اس کا خلاصہ اور تتمہ ہے یعنی ان مسلمہ اصولوں کی روشنی میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے اخذ کردہ نیکی بدی اور سیاسی نظام کی حقیقت جاننا۔ اور اس دوسری قسم میں کتاب الإیمان سے شروع کر کے اختتام تک جتنے بھی اُمور تھے، ان تمام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات، یا قرآن حکیم کی نصوصِ قرآنیہ، جنھیں منطوقِ قرآن یا منصوصِ قرآن کہا گیا، ان کے مضامین پر ان اصولی وقواعد کو وہاں پر منطبق (apply) کیا ہے اور ہر ہر باب کی حقیقت واضح کی ہے۔ یہ ایک اجمالی خاکہ ہے علم اسرارِ دین کی مباحث کا۔

واقع کے تعین کی اہمیت

شاہ صاحبؒ نے یہ بات بھی فرمائی کہ جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا، اس وقت تک جتنے مذاہب، ملتیں یا سکول آف تھاٹ تھے، بلکہ آج تک جتنے بھی افکار و خیالات کے ماننے والے ہیں، ان تمام کے ہاں کائنات کے متعلق جو تسلیم شدہ قاعدے اور ضابطے ہیں، کم از کم جمہور انسانوں کے نزدیک وہ یہی ہیں۔ تو شاہ صاحبؒ نے ابتدائی ابواب میں دین اسلام ہی کی روشنی میں اور دیگر مذاہب کے گہرے مطالعے سے وہ "واقع"، متعین کیا ہے، جس کی اساس پر آرا کی تطبیق دینی ہے کہ وہ کس قدر اس کے ساتھ منطبق ہیں اور کس قدر مختلف ہیں۔ اس طرح تجزیہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ مشائین یعنی جو عقل کی بنیاد پر باتیں کر رہے ہیں، انھوں نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے؟ جو صرف کشف کی اساس پر بات کر رہے ہیں یعنی متأخرین صوفیا، ان سے کہاں غلطی ہوئی؟ جو صرف نقل کی بنیاد پر بے شمار روایات، بغیر ان کی حیثیت متعین کیے ہوئے نقل در نقل کر رہے ہیں، تو ان کا بھی پتہ چل جائے گا، اسی طرح متکلمین نے کس جگہ ٹھوکر کھائی، اس کا بھی علم ہو جائے گا اور اشراقیین کو کہاں غلطی لگی؟ وہ بھی سامنے آجائے گا۔ جب کہ آج کا یورپ انھیں مشائیہ کے نقش قدم پر ہے۔ اس سے ہٹ کر تو کچھ نہیں ہے۔ اسی فلسفہ یونان کے مختلف سکول آف تھاٹ میں سے اگر ایک زمانے میں بطلیموسی سائنس (Ptolemaic science) تھی یا قبل مسیح کے فیثا غورث اور افلاطون کے نظریات آگے بڑھے، اس سے آگے تو کوئی فلسفہ آج بھی سامنے نہیں آیا۔ سوشلزم ہو یا کیپٹل اِزم، ان دونوں کی بنیاد بھی اُسی مادی فلسفے پر ہے۔ وہی فلسفہ یونان ان کا مرکز اور بنیاد ہے۔

لہٰذا اگر شاہ صاحبؒ کا نظریہ اسرارِ دین ہمارے سامنے وضاحت سے آجائے تو آج کے دور کے جتنے فلسفی بھی ہیں اور فلسفوں کے حوالے سے جتنے مکتبِ فکر ہیں، ان کا تحلیل و تجزیہ کرنا بھی ایک مسلمان عالم کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بنیادی حقیقت شاہ صاحبؒ نے واضح کرنے کے بعد کائنات کی حقیقت سے متعلق چند بنیادی اساسی امور متعین کیے ہیں، جو تمام مذاہب اور تمام فلسفوں میں تعبیرات کے اختلاف کے باوجود متفق علیہ ہیں۔ کسی نے ایک انداز سے تعبیر کیا ہے، کسی نے دوسری طرح سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی تعبیرات کے اختلافات کو شاہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں زیرِ بحث نہیں لائے ہیں، بلکہ اس بحث کو اپنی دیگر کتابوں جیسے لمحات، البدور البازغہ، سطعات وغیرہ میں لائے ہیں، وہاں اشراقیین اور دوسرے لوگوں پر گفتگو کی ہے۔ کہیں کہیں شاہ صاحبؒ متکلمین کے اقوال کو بیان کر کے رَد بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی کو نہیں چھیڑا۔ حجۃ اللہ البالغہ کو سمجھنا اس لیے بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی دیگر کتابوں کا اس کے ساتھ جو ربط (link) ہے، وہ سامنے نہیں ہوتا۔

ابداع کا تصور

شاہ صاحب کہتے ہیں کہ اس کائنات کے بارے میں مسلمہ قاعدے اور ضابطے ہیں۔ جو کمالات اربعہ

کہلاتے ہیں۔ پہلی حقیقت یا کمال پر سب انسانوں کا اتفاق ہے کہ یہ کائنات اللہ نے بغیر کسی مادے کے پیدا کی ہے۔ کائنات کا سب سے پہلے مادہ پیدا کیا، خواہ کسی بھی شکل میں ہو۔ اسکی کیا حقیقت تھی؟ ظاہر ہے کہ ہر ایک نے اپنے اپنے دائرے میں تعریف کی۔ شاہ صاحبؒ نے اس کو ''ابداع'' سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ بدیع السماوات و الارض۔

ابداع کی تعریف یہ ہے کہ مادی چیز کے بغیر کسی مادے کو تخلیق کرنا۔ تو اس کرۂ ارض یا اس پورے نظامِ شمسی بلکہ اس پوری کائنات، عرش سے لے کر فرش تک اس پورے کا مادہ بنایا۔

خَلق کا تصور

دوسری بنیادی حقیقت یا کمال ''خَلق'' ہے کہ مادے سے اللہ نے مخلوق پیدا کی۔ اور مخلوق کا مطلب کیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ جب بھی ایک چیز دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، تو کچھ ان میں مشترکہ امور ہوتے ہیں اور کچھ امتیازی امور ہوتے ہیں۔ اور اسی شکل میں انواع و اجناس اور اقسام پیدا کیں۔ اللہ نے کائنات کے عناصر پیدا کیے۔ ایک زمانے میں بحث کے لیے یہ متعین کیا گیا تھا کہ یہ عناصر چار ہیں: آگ، پانی، مٹی، ہوا۔ اور آج جب مزید تحقیق ہمارے سامنے آئی کہ عناصر ایک سو نو یا ایک سو اٹھارہ مختلف ترتیب سے ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ الغرض! کوئی بھی متعین کرلو! جدید تحقیق کے عناصر لے لو، یا قدیم فلاسفہ یونان کے طے کردہ۔ کیوں کہ علم کے اندر بحث کرنے کے لیے سب سے پہلے کوئی نہ کوئی نقطہ لگانا پڑتا ہے جیسے آپ پرکار (compass) سے ایک نقطہ لگاتے ہیں سفید کاغذ پر، پھر پیمائش کرتے ہیں کہ اتنے سے ادھر جائیں اور اتنے سے ادھر جائیں تو ایک مربع یا مستطیل وغیرہ وغیرہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ نقطہ ہل گیا تو سارا ڈھانچہ ہل جائے گا اور علم آگے نہیں بڑھے گا۔ لہذا آپ کو ایک نقطہ فرض کرنا پڑے گا چاہے چار عناصر جو قدیم فلاسفہ کا نقطہ نظر تھا یا ابھی ہماری تحقیق پہنچی ہے ایک سو نو یا ایک سو اٹھارہ عناصر تک اور نہ جانے اگلے سائنس دان اس سے آگے بڑھ کر کچھ اَور چیزیں دریافت کرلیں۔ تو جہاں سے بھی شروع کرلو تو اللہ نے اس مادے سے تخلیق کی ہے اور تخلیقات کے جو بنیادی ڈھانچے بنائے ہیں، معدنیات، اگلا مرحلہ نباتات، اس سے اگلا مرحلہ حیوانات اور اس سے اگلا مرحلہ انسان۔ کم از کم تمام فلاسفہ اور عقل اور حکما کے ہاں یہ چار کم از کم انواع یا اجناس ہیں اور اگر فلسفے کی زبان میں بحث کی جائے تو جوہر و عرض کی بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جوہر یعنی جسم مطلق، پھر جسم نامی اور پھر جسم حیوانی، اور حیوان سے آگے انسان نوع ہے۔ تو انواع، اجناس اور اس کے اوپر کی اجناس یعنی جنس قریب یا جنس بعید کی ترتیب ہے، کسی زبان میں آپ گفتگو کرلیں تو کم از کم مذکورہ چار دائرے آپ کے سامنے آجائیں گے۔

اللہ نے تخلیق کے وقت اس مادے سے ان کے مابہ الامتیازات (characteristics) کی وجہ سے علاحدہ مخلوق پیدا کی اور جب علاحدہ علاحدہ مخلوق پیدا ہوئی تو ہر عنصر اور ہر ایلیمنٹ کی ایک خاص خاصیت رکھی۔ مثلاً

آکسیجن کے جو خواص ہیں، وہ ہائیڈروجن اور دوسرے باقی ایلیمنٹس کے نہیں ہیں۔ ہر ایک عنصر کا ایک خاص خاصہ ہے۔اور یہ بات طے شدہ ہے تخلیق میں کہ جو چیز جس خاصے پر پیدا کر دی گئی ہے، وہ خاصہ کبھی اس سے نہیں بدلتا۔ وہ ہمیشہ وہی رہے گا قیامت تک۔ تخلیق کا بنیادی نظریہ یہ سامنے رکھنا چاہیے کہ تخلیق ہمیشہ مادے سے ہوتی ہے۔ بغیر مادے کے براہِ راست تخلیق نہیں ہوتی۔اس کا پروسیجر یہ ہے کہ پہلے مادہ بنے گا اور پھر مادے سے یہ تخلیق کا عمل ہوگا۔ اور جب تخلیق ہوئی اور مخلوقات وسیع ہو گئیں یعنی ایک دوسرے سے مختلف ومتضاد انواع واجناس، مثلاً ایک ہی جنس قریب یعنی حیوان کے ذیل میں گھوڑا، گدھا اور انسان وغیرہ وغیرہ انواع ہیں، تو یہ مختلف بن گئے۔

تدبیر کا تصور

جب تضادات پیدا ہوتے ہیں تو ٹکراؤ ہوتا ہے۔ تو اللہ کا ایک تیسرا کمال ظاہر ہوا، جس کو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''تدبیر'' سے تعبیر کیا ہے کہ اللہ نے ان کے درمیان ایک مربوط نظام اور ہم آہنگی پیدا کی۔ لہٰذا مخلوقات کے ٹکراؤ میں ایسا ٹکراؤ جس سے ایک مخلوق سرے سے فنا ہو جائے، یہ مقصدِ تخلیق کے خلاف بات ہے۔ اب جب اُس کو باقی رہنا ہے تو کوئی نہ کوئی ہم آہنگی تو ہونی چاہیے، کوئی تدبیر تو ہونی چاہیے اور کوئی سسٹم بننا چاہیے تو اللہ نے اس کائنات کو ایک نظام کے تحت چلایا ہے۔ چناں چہ اللہ پاک نے جیسے قرآن حکیم میں **خلق الارض و السماوات** ذکر کیا اسی طرح تدبیر کی بات کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے **یدبر الامر من السماء الی الارض** بیان کیا کہ وہ آسمان وزمین کی تدبیر اور نظام بناتا ہے۔ تو کائنات ایک سسٹم کے تحت چل رہی ہے۔ کائنات بغیر کسی سسٹم کے نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ جب مخلوقات وجود میں آئیں تو ان مخلوقات کے باہم ٹکراؤ سے قوتیں پیدا ہوئیں۔ توانائیاں (energies) آئیں۔ ان توانائیوں کے درمیان جب تضاد کا عمل ہوا تو ان تضادات کو حل کرنے کی ایک تدبیر یا سسٹم بنایا گیا۔ سسٹم کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر ایک قوت، ہر ایک فرد اور ہر ایک جماعت ڈسپلن کے تحت اپنے اپنے دائرے میں رہے۔ وہ لاٹھی ضرور ہلائے، لیکن کسی دوسرے کی ناک توڑنے کی اجازت نہیں۔ ڈسپلن میں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ تدبیر کا ایک نظام بنائے۔ اور اس تدبیر کے سسٹم کو حاصل کرنے کے لیے چار طریقے شاہ صاحبؒ نے بیان کیے: قبض، بسط، احالہ اور الہام۔ کہ جب قوتوں کے درمیان ٹکراؤ ہو۔ مصلحتِ کلیہ، کائنات کا اور مخلوقات کی بقا کا نظام تقاضا کرتا ہے کہ جو قوت اس ٹکراؤ کے نتیجے میں فنا ہونے کے گھاٹ پہنچ رہی ہے، اس کو باقی رکھنا ضروری ہے تو اس کو ذاتِ باری تعالیٰ کے فرشتوں کی طرف سے انرجی اور طاقت سپلائی کی جاتی ہے۔ اس کو کہتے ہیں ''بسط'' اور جو طاقت چڑھائی کر کے دوسرے کو فنا کے گھاٹ اتار رہی تھی تو سسٹم، قوتوں کے درمیان توازن رکھنے کے لیے، جو قوتیں کچھ منہ زور ہو رہی ہوں، ان کو کنٹرول میں لاتا ہے، اس کو ''قبض'' کہتے ہیں۔ اس طرح جو قوتیں کمزور ہیں، یا مظلوم ہیں، ان کو بڑھانے کے لیے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ تو قبض اور بسط، تدبیر کے

دو یہ پہلو ہیں۔

اور اگر دونوں سے کام نہیں بن رہا تو اس کے ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ مادہ (ظاہر ہے کائنات مادے اور عناصر کی بنیاد پر ہے) ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل (convert) ہو جاتا ہے۔ ہم مادہ کو نہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ فنا کر سکتے ہیں، لیکن مادہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیل ہوتا ہے۔ اس کو شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں ''احالہ'' کہا جاتا ہے۔ اور اگر جان داروں کا معاملہ ہے تو جانداروں میں ایک چوتھا عمل یہ ہوتا ہے، ان میں خیال ڈال کر دوسرے کے ظلم سے بچنے، یا دوسرے کی طاقت سے نکلنے یا اپنی قوت کو بڑھانے کے لیے طریقہ بتلانا، اس کو ''الہام'' کہا جاتا ہے۔ تو تدبیر یعنی سسٹم کے یہ چار امور اس پوری کائنات میں جاری ہیں اس لئے کائنات کا تیسرا قاعدہ پیش نظر رہنا چاہیے۔

عالم مثال کا تصور

اور چوتھی حقیقت جس کو شاہ صاحبؒ نے پورے دلائل سے ثابت کیا ہے، وہ یہ کہ خالق کائنات نے اس کائنات کا نظام اور بالخصوص اس کرۂ ارض یا نظامِ شمسی پر جو اللہ کے احکامات یا کائنات کے سسٹم سے متعلق اُمور آتے ہیں، ان کے اور اس کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات یا توانائیوں یا تجلیات کے ذریعے سے کائنات کی تخلیق کا عمل ہوا ہے، قرآنی نصوص نے یہ بات واضح کی ہے کہ یہ تمام اعمال فرشتوں کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ ایک مسلمان جب ایمان لاتا ہے تو اللہ پر ایمان لانے کے بعد فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ملائکہ کون ہیں؟ وہ نظم و نسق چلانے والی ایسی اتھارٹی کہ ارشاد ربانی ہے:

لایعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون

کہ جو انھیں حکم دیا جاتا ہے، وہ کام کرتے ہیں اور سرتابی نہیں کرتے تو یہ فرشتوں کا نظام ہے۔ اب یہ فرشتوں کا نظام، جس عالم میں ہے، اس عالم کو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے کہ یہ عالم مثال ہے۔ اور عالم مثال پر بہت سی احادیث شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں نقل کی ہیں۔ انھوں نے کتاب وسنت سے یہ بات ثابت کی ہے کہ یہ ایک عالم موجود ہے، جس میں اس کرۂ ارض پر آنے سے پہلے ان تمام چیزوں کا غیر مادی ماڈل تیار ہوتا ہے۔ اور اسی ماڈل کے مطابق دنیا میں وہ عمل ہوتا ہے۔

حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے ''عبقات'' میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جو آدمی عالم مثال کو نہیں مانتا، وہ قرآن وسنت کی ہزار آیات واحادیث کی صحیح تعبیر اور تشریح نہیں کر سکتا، بلکہ ان کا انکار کرنے پڑے گا۔ چوں کہ اس عالم سے پہلے جہاں وجود میں آیا تھا، اس کی نص قطعی قرآن میں موجود ہے کہ اللہ نے جب تمام انسانوں کو پیدا کیا، تو ان سے جو میثاق لیا گیا، اسے عہد ''الست'' کہا جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ آدم علیہ السلام

کو پیدا کرنے کے بعد اللہ نے ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ساری کائنات میں آخر تک پیدا ہونے والی مخلوق کے نسمے، یعنی روحِ ہوائی پیدا ہو کر ظاہر ہو گئے۔ (روایت میں **نسم بنیہ** کا لفظ آتا ہے کہ اُس کی اولاد کے تمام روحانی نسمے سامنے آگئے) اور تمام سے اللہ نے عہد لیا تھا کہ **الست بربکم**۔ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) انھوں نے کہا تھا: بلیٰ! (کیوں نہیں؟)

پھر فرشتہ پیدا ہونے والے انسان کی روح لے کر اوپر سے نیچے آتا ہے۔ رحم مادر میں تو اس کا جسم یہاں بنا اور روح وہاں سے آئی۔ یوں اس کا دنیا میں آنے کا عمل اور پھر دنیا میں بھی بچپن سے لے کر بڑے ہونے اور بوڑھے ہونے تک کا ایک سفر ہوتا ہے تو اس کے ہم مثل یعنی جیسی روح وہاں ہوتی ہے، ویسا ہی اس کا جسمانی ڈھانچہ اس دنیا میں وجود میں لایا جاتا ہے اور یہ صرف انسان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہاں جتنی بھی مخلوقات وجود میں آئی ہیں، ان کے لیے یہ ذریعہ استعمال ہوا ہے۔ ان تمام کی یہی ساخت وہاں پر موجود ہے۔

تو اس عالم مثال کو شاہ صاحبؒ نے دوسری جگہ پر ''تجلّی'' یا ''تدلّی'' کہا ہے، تو یہ تجلیات کا ایک نظام موجود ہے۔ اور اس کے بھی دو طبقے ہیں: ایک بالائی، جو عرشِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور ایک یہاں زیریں جو زمین کے ساتھ جو وابستہ ہے، یعنی ملاءِ اعلیٰ اور ملاءِ سافل، یہ اصطلاح قرآن میں موجود ہے۔ یعنی فرشتوں کا وہ مربوط نظام جو کائنات میں عرش سے فرش تک جاری و ساری ہے، یہ اس کائنات کا چوتھا اہم ترین عمل ہے۔ گویا کہ اللہ کے کمالات ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی یا تجلی کی اساس پر یہ کائنات جاری و ساری ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کائنات اور اس کے نظام اور اس کے اندر جتنی بھی چیزیں ہیں، ان کی جو خاصیات اور ان کے اثرات و نتائج ہیں، ان پر گفتگو کر کے یہ بات واضح کر دی کہ یہ کائنات اور یہ انسان جو اس کرۂ ارض میں ہے، یہ زیر اثر ہے عالم مثال کی مثالی قوتوں اور ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کے، جو کائنات کا نظام چلا رہے ہیں اور انسان کی خدمت پر مامور ہیں۔

انسان کا تو اپنا ایک نفس اور ذات ہے۔ ذات سے اوپر اس کے نوعی تقاضے، یعنی انسانی تقاضے ہیں جو نوعِ انسانیت کے خواص کی صورت میں موجود ہیں۔ اس نوعِ انسانی پر اگلا دائرہ عالم مثال کی ذیلی قوتوں، یعنی ملاءِ سافل کا ہے۔ اور اس سے اوپر ایک اَور دائرہ' کائنات کے اندر ملاءِ اعلیٰ کا ہے اور اس کے اوپر ذاتِ باری تعالیٰ کی طاقت اور قوت ہے۔ یہ کائنات کا بنیادی سٹرکچر ہے، جو یہودیت، عیسائیت سمیت انبیا کے تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے اور اسی طریقے سے حکما جب حکمتِ الٰہیہ پر اپنے خیال کے مطابق بحث کرتے ہیں۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ایک تو واجب الوجود ہے اور واجب الوجود نے ''عقل اوّل'' پیدا کی۔ اس نے ''عقل ثانی'' پیدا کی۔ اور پھر ''عقل عاشر'' تک اس کائنات، یعنی مخلوق کے ربط (link) کا حال ان کے ہاں بھی زیر بحث رہا ہے۔ ان کے ہاں بھی یہ بات اسی طریقے سے مسلم ہے۔ یہاں جو تعبیرات ہم نے بیان کی ہیں، وہ قرآن حکیم کی ہیں جو جامع ہیں، اور جو باقی لوگوں سے تعبیرات میں جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان پر شاہ صاحبؒ نے اپنی کتابوں میں بات کر کے واضح کیا ہے کہ اُن کی تعبیر

میں کہاں غلطی یا کمزوری ہے۔

سنت الٰہی کا تصور

شاہ صاحبؒ نے اسی کے ساتھ ایک اَور قانون اور ضابطہ متعین کیا ہے، جو قرآن حکیم میں ہے:

و لن تجد لسنة الله تبديلا.

کہ آپ اللہ کے جاری کردہ سنت میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں پائیں گے۔ اس سے استدلال کر کے شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ اللہ نے جو مخلوق پیدا کر دی، اس مخلوق کے لیے جو تدبیر بنا دی، اور اس کا جو سسٹم اللہ پاک نے وجود میں لا کر یہاں اس کرۂ ارض پر انسان کو رکھا ہے، اس سسٹم میں چیزوں کے تمام خواص و تاثیرات نہیں بدل سکتے۔ ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

و لن تجد لسنة الله تحويلا.

اس لیے کہ اگر تبدیلی آ جائے تو جو مخلوق اللہ نے پیدا کی ہے، اس میں سے کوئی نہ کوئی حصہ فنا ہو جائے گا اور اللہ کا یہ قانون اور ضابطہ ہے کہ جو پیدا شدہ مخلوق ہے، اس کے قاعدوں اور ضابطوں میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہے۔

انسان کی مرکب حقیقت

کائنات کی حقیقت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شاہ صاحبؒ نے خود انسان پر بھی بحث کی ہے کہ انسان کون ہے؟ انسان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے کہا کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے: ایک مَلَکِیت اور دوسرا بہیمیت۔ اس کا یہ جسم، معدنیات، نباتات اور حیوانات کے وجود کے بعد انسانی شکل میں آیا ہے۔ اس کے جسم کے تمام جسمانی تقاضے حیوانیت اور بہیمیت کی اساس پر ہیں کہ اس کو بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے۔ گرمی سردی سے بچاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو اس کرۂ ارض پر رہنے کے لیے لباس کی اور دیگر چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جو اس کے جسم کے تقاضے ہیں۔ تو جسمانی تقاضوں کا تعلق اس کی بہیمیت کے ساتھ ہے۔

اسی طریقے سے اس کی روحِ حقیقی اوپر سے آتی ہے۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے روح پر ایک بڑی شاندار بحث کی ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ روح نام ہے صرف اس مبدأ حیات کا کہ جس سے سانس چل رہا ہے اور زندگی چل رہی ہے۔ جیسے جانور میں بھی ہے۔ مثلاً بکری میں بھی ہے اور انسان میں بھی ہے، گویا ان میں مشترک ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ: ہم جب اس پر غور و فکر کریں اور مزید اس کی کھوج لگائیں تو یہ انسانی مبدأ حیات نہیں کیونکہ یہ تو جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے تو انسان اور جانور میں کیا فرق ہے؟ ماضی کے طبیبوں اور حکماء نے یا آج کے ڈاکٹروں نے غور و فکر کر کے کہا کہ یہ جو ہم غذا کھاتے ہیں، اس غذا سے ایک توانائی یا انرجی پیدا ہوتی ہے۔ اس انرجی اور توانائی کو حکماء نے قوتِ مدبرۂ بدن کہا۔ ڈاکٹروں نے اُسے وائٹل فورس (vital force) کہا۔ اور احادیث کے مطابق صوفیا

نے اسے نسمہ کہا (جیسے نسم بنیہ کا لفظ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال کیا) یا کچھ حکماء نے اس کے لیے روحِ ہوائی کی تعبیر کی کہ کھانے سے جو توانائی پیدا ہوتی ہے، وہ ایک ہوا کی طرح جسم کے اندر گردش کرتی ہے سر سے پاؤں تک۔ تو اس کو انھوں نے کہا کہ یہ روح ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ یہ بھی حقیقی روح نہیں ہوسکتی۔ یہ اس لیے روح نہیں ہوسکتی کہ تغیر وتبدل انسان کے اندر ہوتا رہتا ہے کہ انسان کی مختلف حالتیں ہیں۔ غذا کے فرق اور غذا کی دیگر نوعیت کی وجہ سے انسان کی وائٹل فورس میں تغیر آجاتا ہے۔ آج میڈیکل سائنسز نے ثابت کردیا کہ ہمارے جسم میں جو خلیات (cells) موجود ہوتے ہیں، وہ ایک سو بیس دن کے بعد پُرانے ہوکر نکل جاتے ہیں۔ اور نئے سیلز اُن کی جگہ لے لیتے ہیں۔ تو یہ سیلز جو خوراک کے ذریعے سے بنے تھے، اگر خوراک ہی کی توانائی، روح ہے تو یہ تو ہر ایک سو بیس دن کے بعد بدل جاتے ہیں۔ لیکن ان بدلتی ہوئی حالتوں میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو تمام تر جسمانی تغیرات وتبدلات کے باوجود اپنی جگہ پر قائم ہے مثلاً زید، زید ہی رہتا ہے۔ بکر، بکر ہی رہتا ہے۔ یعنی انسان تو وہی رہتا ہے۔ اس کا نام بچپن میں جو ہم نے رکھا ہے، آخر تک وہی چلتا ہے۔ لہذا عقلی طور پر کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جس پر تغیر نہ آئے اور اس کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہو۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ کوئی اَور چیز ''روح'' ہے۔ اور وہ غیر متبدل حقیقت ہے۔ اس کی تعریف شاہ صاحبؒ نے یوں کی: حقیقة فردانية و نقطة نورانية وہ ایک ناقابل تقسیم حقیقت ہے۔ ایک ایسا ایٹم (atom) ہے جو تقسیم کو قبول نہیں کرتا اور ایک نورانی نقطہ ہے۔ یہ جو روحِ ہوائی یا نسمہ ہے، اس کے تمام تر تغیرات کے باوجود اس کے ہر تغیر کو یہ نقطہ روشن کرتا ہے۔ اس سے وہ روشنی پاتا ہے اور توانائی حاصل کرتا ہے۔ گویا آج کی زبان میں یہی وہ چپ (chip) ہے جو فرشتہ اوپر سے لاکر ماں کے پیٹ میں تین مہینے کے بچے کے اندر فٹ (fit) کرتا ہے۔ یہ وہ نقطہ نورانی ہے جس نے اس کی انرجی کی بیٹری چارج کردی اور انسان کے اندر سانس لینے کا عمل بحال ہوگیا۔ تو روحِ حقیقی یہ پیدا شدہ نقطہ ہے۔ اسی نے الست بربکم (کیا میں تمھارا ربّ نہیں؟) کا جواب بلیٰ (کیوں نہیں!) کی شکل میں دیا تھا۔ یہ یہاں آیا ہے اور اسی کے اثر سے یہاں پوری زندگی بسر کرتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ اور جب اس کا وقتِ مقررہ آتا ہے تو موت کے مرحلے سے ایک نئے دور میں یہ داخل ہوجاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے موت کی حقیقت بھی بتلائی۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ عام طور پر موت کی حقیقت یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی وائٹل فورس ختم ہوگئی یا کم ہوگئی، یا قوتِ مدبرۂ بدن یا دفاعی نظام ختم ہوگیا تو موت واقع ہوگئی۔ شاہ صاحبؒ نے کہا: ایسا نہیں۔ قوتِ مدبرۂ بدن یا نسمے اور جسم کے درمیان جدائی کا نام موت نہیں ہے۔ موت اُس نقطے کا یہاں سے نکل کر چلے جانا ہے۔ اور اپنے ساتھ وہ اس نسمے کا کچھ حصہ ساتھ لے کر جاتا ہے، جس پر تمام اگلے اثرات و نتائج مرتب ہوں گے۔

الغرض شاہ صاحبؒ نے کہا کہ یہ انسان ایک اس قوتِ ملکی یعنی نقطہ نورانی اور ایک جسم یعنی ان دونوں پر مشتمل

ہے۔ طہارت کی ضد گندا رہنا ہے۔ پراگندہ بال، لباس کا میلا کچیلا ہونا، بال بکھرے ہوئے ہوں۔ یہ حیوانیت کے تقاضے ہیں۔ تو انسانی کامیابی کا ایک معیار طہارت ہے۔ اب طہارت انسان کے لیے ضروری ہے اور دنیا کے ہر مذہب میں ہے۔ حتیٰ کہ ایک دہریہ بھی صبح اٹھ کر منہ ضرور دھوئے گا، ہاتھ ضرور دھوئے گا اور اگر سردی کے موسم میں پورے جسم کا غسل نہ بھی کرے، تو کم از کم چہرہ اور ہاتھ دھو کر چاہے ایسا لباس ہی کیوں نہ پہنا ہوا ہو، جس کو کئی کئی ہفتے چلا لے گا۔ لیکن چہرہ ضرور دھوئے گا۔ اب طہارت کے معیارات ہر ایک نے طے کیے ہیں۔ یہودیت نے اپنے، عیسائیت نے اپنے، ہندومت نے اپنے، دوسرے مذاہب نے اپنے۔ شاہ صاحبؒ اس پر بات کرتے ہیں کہ طہارت کا جامع ترین اور سائنٹفک تصور دین اسلام میں ہے کہ کس وقت کون سی گندگی ہو تو کس درجے کی طہارت حاصل کرنی چاہیے۔ کس وقت غسل ضروری ہے اور کس وقت وضو سے ہی کام چل جائے گا۔ اور جسم کے چاروں اطراف، دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور سر پر مسح یا چہرے کا دھونا، یہ حدثِ اصغر کے اندر کافی ہے اور حدثِ اکبر کے اندر غسل ضروری ہے۔ اس کا ایک مربوط نظام، دین لے کر آیا ہے۔ تو پہلا خُلق طہارت ہے اور یہ طہارت دنیا بھر کے تمام مذاہب، فلسفوں اور ملتوں کا متفقہ قاعدہ اور ضابطہ ہے۔

اِخبات کا خُلق

اسی طریقے سے دوسرا بنیادی خُلق اخبات الی اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہونا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے عجز و انکساری کرنا ہے۔ باقی جتنے بھی مذاہب ہیں، مثلاً جو الٰہی مذاہب کہلاتے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت اور ابراہیمی مذاہب جنھیں کہا جاتا ہے، اُن کے اندر یقیناً خدا کا تصور ہے اور خدا کے سامنے عجز و انکساری کا اقرار اُن کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ اسی طریقے سے جو غیر الٰہی مذاہب بھی ہیں، اور قدیم زمانے سے مسخ ہو چکے ہیں، ان کے ہاں بھی کسی نہ کسی خدا کا، God کا، برہمہ وغیرہ کا، کوئی نہ کوئی تصور موجود ہے اپنے خیال کے مطابق۔ مرورِ زمانہ سے اُن کی جگہ دیوی دیوتاؤں نے لے لی ہو، لیکن اصل میں تو اُن کے دماغ کے اندر بنیادی چیز ہے، وہ کسی نہ کسی ذات کے سامنے جھکنے اور انکساری کی ہے۔ اور تو اَور وہ جو دہریہ بھی ہے، وہ بھی کسی نہ کسی سپیریئر (superior) طاقت کو محسوس کرتا ہے، جہاں اُس کی عقل جواب دے جاتی ہے، یا اس کی عقل وہاں درماندہ ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ آئن سٹائن (1955ء) سے متاثر ہو یا نیوٹن (1727ء) سے، یا آج گریوی ٹیشنل ویوز (gravitational waves) کا مشاہدہ کرنے والے کسی سائنس دان کے کسی سوال کو مانے۔ کہیں نہ کہیں آ کر اُس کا دماغ عجز و انکساری کو ضرور تسلیم کرتا ہے۔ یہ اخبات ہے۔ اس کی جامع ترین اور اس کا ایک مکمل اور مربوط سسٹم اور ضابطہ کاری کا عمل اگر کسی نے کیا ہے تو وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی اساس پر کیا اور توحید پر عمل درآمد کرنے کا نظام نماز روزہ وغیرہ کے ذریعے سے متعین کر دیا۔

سماحت کا خُلق

تیسرا بڑا بنیادی خُلق سماحت ہے کہ ہر انسان عزت و وقار چاہتا ہے۔ وہ اپنی توہین (insult) برداشت نہیں کرتا۔ اُس کے اندر ایک وقار کی کیفیت ہے۔ عظمت اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہر مذہب کا ہر صاحبِ سماحت (باوقار شخص) اس عزت و وقار کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی حفاظت کیلئے قاعدے ضابطے بنائے جاتے ہیں۔ غیبت کرنا، کسی پر بہتان لگانا، یہ دراصل اُس کی عزت کو مجروح کرنے والے اعمال ہیں اور عفت، سخاوت، ہمدردی، صبر، جدوجہد، عفوودرگزر، قناعت اور تقوی کو شاہ صاحبؒ نے سماحت کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

عدل کا خُلق

چوتھا اور اہم ترین خُلق عدالت ہے۔ ہر انسانی سماج میں سماجی معاہدات ہوتے ہیں۔ ایسا کوئی معاشرہ نہیں ہوتا، جس میں سماجی معاہدات نہ ہوں۔ سماج گھر کا بھی ہو، وہ بھی ایک معاہدے کے تحت وجود میں آتا ہے۔ معاہدۂ نکاح کے تحت دو خاندانوں کے درمیان معاہدہ ہوا ہے اور اسی معاہدے کی اساس پر بازار بھی ہے، اسی معاہدے کی اساس پر قومی سیاسی، معاشی، سماجی نظام بھی ہے، عدالتی آئینی اور قانونی ڈھانچہ بھی ہے، سیکیورٹی فورسز کا نظام بھی اُسی کے ذیل میں ہیں۔ اور پھر ممالک اور اقوام کے درمیان بین الاقوامی معاہدات بھی ہیں۔

ان معاہدات کے درمیان دو یا دو سے زائد فریق ہر حال میں ہوتے ہیں تو ان فریقوں کے درمیان جو معاہدہ ہو، اس معاہدے کی ممکنہ شکلیں دو ہی ہیں: عدل یا ظلم۔ دونوں فریقوں کی حیثیت برابر ہے تو اس کو کہیں گے عدل۔ اور اگر دونوں فریقوں کی حیثیت برابر نہیں ہے۔ ایک کا پلڑا بھاری اور ایک کا پلڑا کمزور ہے تو اس کو ظلم کہیں گے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ تمام انسانیت اس پر متفق ہے کہ تمام سماجی معاہدات کے اندر عدالت بنیادی چیز ہے۔ اور عدالت کی تشریح شاہ صاحبؒ نے کی کہ یہ ایک ایسا ملکہ (capability) ہے کہ جس کے ذریعے سے کسی مملکت کا نظام درست طریقے سے انصاف کی بنیاد پر قائم کرنے کی اہلیت، صلاحیت اور مہارت پیدا ہو جائے۔ یہ محض انفرادی عدل نہیں کہ ایک آدمی دوسرے کے ساتھ اچھے اَخلاق کا مظاہرہ کرے بلکہ انسانی معاشرے میں عدل کے اصولوں پر مملکت کا بہترین سسٹم بنانا ملکہ عدالت ہے۔

انسانی اعمال کی بحث

شاہ صاحبؒ نے ایک بہت خوب صورت بحث کی ہوئی ہے کہ اعمال کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ کیوں کہ علم اسرارِ دین میں جہاں احکام پر بحث ہے اور نیکی اور بدی کا تعین کرنا ہے، وہاں اعمال کے خواص اور اُن کے نکات پر بھی بحث کرنا ہے۔ تو یہ اعمال کیا ہوتے ہیں؟ کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ تو شاہ صاحبؒ نے اعمال کی پیدائش کے بنیادی اسباب بیان کیے کہ انسان جب کوئی عمل کرنے پر تیار ہوتا ہے تو ہر عمل کے پیچھے اس کا ایک ارادہ ہوتا ہے۔ ارادہ نہ ہو

اور عمل ہو جائے تو یا وہ پاگل اور مجنون ہے یا مجذوب ہے اور دنیا کے قوانین یا علم و فکر کی دنیا میں ایسے لوگوں پر بحث نہیں کی جاتی۔ بحث انھیں پر کی جاتی ہے کہ جو کسی ضابطے میں ہیں۔ ارادہ کیسے وجود میں آتا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے اس پر بحث کی ہے کہ ارادہ وجود میں آتا ہے خیالات کے مجموعے سے۔ کسی کام کا خیال آپ کے دماغ میں آیا۔ ایک دفعہ آیا۔ دوسری دفعہ آیا۔ تیسری دفعہ آیا، یہ جو خیالات کی یلغار ایک کام کے حوالے سے آپ کے ذہن میں آئی یا کسی کام کی تصویر یا کسی کام کا شوق آپ کے دماغ میں، خیالات کی صورت میں قطار در قطار آ رہا ہے، تو اس مجموعہ خیالات نے آپ کے عزم کو اُبھارا کہ آپ یہ کام کریں۔

جبلت کا تصور

یہ جو خیالات آتے ہیں، یہ کیسے آتے ہیں؟ خیالات کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ تو شاہ صاحبؒ نے کہا کہ خیالات کے بنیادی اسباب انسانی جبلت سے پھوٹتے ہیں۔ انسانی جبلت کی اساس پر خیالات وجود میں آتے ہیں۔ بنیادی حیثیت جبلت کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے نبی اکرم ﷺ کی حدیث بیان فرمائی کہ آپ کو اگر کہا جائے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے اُٹھ کر چلا گیا، مان لیں لیکن اگر کہا جائے کہ فلاں آدمی کی جبلت بدل گئی تو اس کی کبھی تصدیق نہ کریں۔ اب یہ جبلت کیا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے لاجواب تشریح کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ جبلت نام ہے اس بات کا کہ ہر انسان پیدا ہوا ہے ملکیت اور بہیمیت سے۔ اب ملکیت کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک ملکیتِ عالیہ اور ایک ملکیتِ سافلہ۔ ملاءِ سافل سے اگر روح وابستہ ہے تو اس کی ملکیت سافلہ ہوگی اور جو ملاءِ اعلیٰ سے مناسبت رکھنے والی روح ہے، جیسے انبیا کرام، اولوالعزم اولیاء اللہ کی، تو وہ ملکیتِ عالیہ کہلاتی ہے یا اونچے درجے کے ذہین لوگ ہیں۔ اسی طریقے سے بہیمیت کی بڑی بڑی دو قسمیں ہیں: ایک بہیمیتِ شدیدہ یعنی خالص بہیمیت، جو طاقت اور توانائی، قوت، غرور اور تکبر سے عبارت ہے شاہ صاحبؒ نے ایک پلے ہوئے نر حیوان کی خصوصیات سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ جیسے اس کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور کمزور وضعیف بہیمیت، کمزور اور مریل جانور کی طرح ہوتی ہے۔

گویا کہ کل چار اقسام ہیں: بہیمیتِ شدیدہ، بہیمیتِ ضعیفہ، ملکیتِ عالیہ اور ملکیتِ سافلہ۔ اور پھر ہر دو قوتوں یعنی بہیمی اور ملکی قوتوں پر مشتمل ایک انسان ہوتا ہے۔ ان قوتوں کی آپس میں مصالحت ہوگی یا دونوں کے درمیان آپس میں کش مکش ہوگی۔ چوں کہ دو متضاد قوتیں ہیں، تو ہر ایک قوت اگر اپنا خالص حکم مانگے گی مثلاً بہیمیت کہتی ہے کہ میری حیوانیت مکمل ہونی چاہیے۔ ملکیت کہتی ہے کہ میری ملکیت مکمل ہونی چاہیے تو ظاہر ہے دونوں کے درمیان لڑائی ہوگی۔ اور اگر ملکیت اپنے اصل حکم سے کچھ نیچے اُتر کر صلح کر لے کہ مجھے بہیمیت کے ساتھ رہنا ہے، اور اس دنیا میں وقت گزارنا ہے تو کچھ کم پر راضی ہو جائے اور اسی طرح بہیمیت کچھ نیچے سے اُٹھ کر ملکیت کی کچھ باتیں مان لے تو اسے کہتے ہیں تصالح کی کیفیت۔

ان دونوں کے باہمی ملاپ سے کل انسانیت کی جبلت کی آٹھ اقسام شاہ صاحبؒ نے بیان فرمائی ہیں۔آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک دنیا کے تمام انسان ان تمام اقسام میں شامل ہیں اور کم وبیش کے فرق سے درمیان میں سینکڑوں ہزاروں قسمیں بن سکتی ہیں کہ کس میں کس درجے کی ملکیتِ عالیہ ہے، کس میں کس درجے کی بہیمیتِ شدیدہ ہے۔کس میں کس درجے کی ملکیتِ سافلہ ہے وغیرہ۔ڈگری کا فرق ہوسکتا ہے۔انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا ایک جسمانی ڈھانچہ ہے۔جسمانی طاقت اور قوت ہے۔شاہ صاحبؒ نے اس کی مثالیں دی ہیں کہ اس کے اندر کتنی ہی جسمانی بوجھ برداشت کرنے کی طاقت ہے۔کتنی بلند آواز گفتگو میں ہے۔کتنی پکڑنے کی طاقت ہے۔کتنی اعلیٰ درجے کی جسمانی طاقت ہے۔اور ایسے ہی اُس کی ملکیت کا اظہار انسانی عقل اور اُس کے شعور سے ہوتا ہے کہ اس کی ذہانت کتنی ہے۔عقل کتنی ہے۔اس میں چیزوں کا ادراک کرنے کی اور مختلف اور منتشر چیزوں میں آپس میں sum-up کرنے کی اور جمع کرنے کی طاقت اور قوت کتنی ہے۔

جبلت میں ملکیت اور بہیمیت کے جو مختلف درجے تھے، تو ہر ایک درجے کے اعتبار سے جس آدمی کی پیدائش جس جبلت پر ہوئی ہے۔مثلاً اس کی بہیمیت ضعیف ہے، پیدائشی نشو ونما (growth) اس کی ناقص ہے کہ بڑے ہونے کے بعد ڈاکٹر کتنے ہی وٹامن کیوں نہ دے، کیا کوئی میڈیکل سائنس ہے جو اُس کو بہادر اور دلیر بنا دے اور بہیمیت اس کی بہتر کردے؟ وہ اس کی جبلت ہے۔یعنی اس کی ساخت بن گئی۔اس ساخت کے اندر رہ کر ہی تمام امور کام کرتے ہیں۔جس درجے کی ذہانت ہوگی، اسی درجے کا ہی بندہ کام دے گا۔البتہ جو اعلیٰ درجے کے لوگ ہوتے ہیں، ان کی نقل اتاریں۔ان کی صحبت میں رہیں۔ان سے سیکھ کر اپنی کمزوریوں کا کچھ مداوا کیا جاسکتا ہے۔یہ تو ہے سیکھنے کا عمل اس لئے جبلت کا یہ حصہ بدل جاتا ہے۔لیکن بنیادی ساخت نہیں بدلتی۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اب انسانوں کے لیے جو رہنما ہوتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کی ملکیت عالیہ اور بہیمیت شدیدہ ہوتی ہے اور وہ یقیناً انبیا علیہم السلام ہوتے ہیں۔اب انبیا علیہم السلام پر انسان کے لیے ایک قانون اور ضابطہ ترقی کا نازل ہونا ہے۔ان کی ملکیتِ عالیہ اپنے علم کے نقطہ نظر سے جب حظیرۃ القدس یا ملاءِ اعلیٰ سے جڑتی ہے تو ان پر علوم نازل ہوتے ہیں۔وہ معیاری علم ہوتا ہے اور پھر ان علوم پر جب عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو عمل کا اعلیٰ ترین معیار انبیا علیہم السلام قائم کرتے ہیں۔یہ اس کی عملی شکل ہوتی ہے اور وہ معیاری عمل ہوتا ہے۔شاہ صاحبؒ نے اس کی آٹھ اقسام بیان کر کے کہا کہ انبیا علیہم السلام کی ملکیتِ عالیہ اور بہیمیتِ شدیدہ ہوتی ہے یعنی ان کی جسمانی طاقت بھی اعلیٰ ترین درجے کی ہوتی ہے اور ان کی ملکیت بھی اعلیٰ ترین درجے کی ہوتی ہے۔اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو امام الانبیا ہیں، ان کی تو ملکیت اور ان کی بہیمیت چوں کہ باقی تمام انبیا سے بھی اعلیٰ ترین ہے، اس لیے کہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ستر طاقت ور مردوں سے زیادہ طاقت تھی اور آپؐ کی ملکیت کا تو کوئی تصور ہی نہیں۔ارشاد خداوندی ہے: کان قاب قوسین او ادنیٰ (پھر فاصلہ دو کمان کے برابر تھا یا اس سے بھی

کم) تو یہ دو قوتیں اعلیٰ ترین درجے کی انبیا کے اندر ہوتی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ پر علوم کے نزول کی مختلف کیفیات اور اس کا پورا پراسیس شاہ صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ انسان کی بہیمیت اور ملکیت کو اعتدال پر رکھنے کے لیے ایک علم کی ضرورت ہے۔ اور وہ علم کون کون سے ہیں؟ جن علوم کی ہم نے کل (پہلے لیکچر میں) بات کی تھی، ان میں سب سے پہلا علم القرآن ہے۔ شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں شریعت پر بحث کرتے ہوئے کہ جس کا انسانوں کو مکلّف بنایا گیا ہے، اس میں سب سے پہلا علم القرآن ہے اور جس میں علوم خمسہ شامل ہیں۔ اور یہ سب سے پہلے انسان کی ترقی اور کامیابی کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور قرآن کی شکل میں سامنے آئے۔ اور پھر احادیث میں اس کی عملی تفصیلات ہیں۔

انسان کے طبعی مزاج کا اثر

جب انسانوں کو جبلت کی اساس پر ان اعمال اور قوانین کا مکلّف بنایا گیا ہے تو اسی سے ہی جزا و سزا سامنے آئیں گے کہ انسان کے خیالات کو پیدا کرنے کا اہم اور بنیادی ذریعہ اور سبب انسان کی جبلت ہے۔ خیال پیدا کرنے کا دوسرا ایک سبب انسان کا طبعی مزاج ہے۔ اور طبعی مزاج بدل جاتا ہے خوراک سے۔ شاہ صاحبؒ نے مثال دے کر کہا ہے کہ کوئی آدمی شدید اور طاقت ور غذائیں کھائے، تو ظاہر ہے اس کا بلڈ پریشر ہوگا تو خیالات بھی ویسے آئیں گے۔ اور کسی نے کوئی ہلکی اور سادہ غذا کھائی تو اس کے خیالات اسی طرح کے کمزور اور نرم مزاجی کے ہوں گے تو خوراک کے اثرات سے بھی خیالات کا تغیر و تبدل ہوتا ہے۔

ماحول و عادت کا اثر

ایک اور طریقہ جس کے ذریعے انسان کے اندر خیالات آتے ہیں، وہ نوعِ انسانی کا ماحول اور عادات ہیں کہ کل انسانیت کی انواع و اقسام چاروں طرف موجود ہیں، انسان اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔ انسان کسی انسان کو کوئی کام کرتے دیکھتا ہے تو وہ اس کی نقل اُتارتا ہے کہ اس کے ذریعے اس کے دماغ میں ایک خیال آ گیا، اب وہ خیال مسلسل اس کے دماغ میں بیٹھا ہے۔ آج کل تو اس دماغ کو بیچنے کا کام ملٹی نیشنل کمپنیاں ہمارے سامنے کرتی ہیں۔ روزانہ ٹی وی پر اشتہارات کے ذریعے سے اپنے خیالات اُنڈیلتی ہیں کہ یہ چیز جو ضرورت کی نہیں بھی ہے، وہ بھی خرید کر گھر لے جاؤ۔ تو یہ پورا خیالات کو کنٹرول کرنے کا یا خوابوں کا بیچنے کا عمل ہے۔ خواب بیچے جاتے ہیں۔ خیالات بیچے جاتے ہیں۔ الغرض یہ خیالات ہیں جس کے ذریعے کام ہوتا ہے۔ یہ خیالات ہمارے دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے ارادے بنتے ہیں کسی چیز کے خریدنے، بیچنے کے اور دیگر معاملات کے۔

بالائی نظام کا اثر

ان کے علاوہ دیگر طریقے جو انسانی خیالات پر اثر انداز ہوتے ہیں، وہ ملاءِ سافل کی قوتیں اور عالم مثال کی

زیریں قوتیں ہیں۔ ان میں فرشتے بھی ہیں اور متوازی شیطانی قوتیں بھی ہیں۔ وہ بھی انسانی دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کوئی شیطانی خیال دماغ میں آ گیا انسانوں کو نقصان پہنچانے کا تو اس کے اثرات بھی آتے ہیں۔ اور اگر کسی فرشتے کی طرف سے کسی انسان کو ایک دم خیال اشراق (روشنی کی کوند) کے طور پر پہنچا تو اس خیال کے زیر اثر اس نے کوئی ارادہ باندھ لیا اور جو اعلیٰ ترین درجے کے انسان ہوتے ہیں، انبیاء اور اولیاء، ان کے اوپر تو ملاءِ اعلیٰ کے خیالات اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ ان کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ان کی روح ایک لمحے کے لیے بطور اشراق ملاءِ اعلیٰ سے جڑتی ہے اور ایک خیال کا پودا ان کے دماغ میں آتا ہے، اس کے نتیجے میں ایک علم ان کے سامنے آ جاتا ہے، یوں کشف و انکشاف ہو جاتا ہے۔

اعمال و اخلاق کا باہم تعلق

اس طرح مختلف چیزیں خیالات پیدا کرتی ہیں۔ ان خیالات کے مجموعے سے ارادے بنتے ہیں۔ ارادے کے مجموعے سے اعمال وجود میں آتے ہیں۔ یوں اعمال کی پیدائش ہوتی ہے۔ جب عمل آپ نے کر لیا تو کیا عمل کرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے؟ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ اس پر بھی تمام مذاہب اور تمام فلسفوں کا اتفاق ہے کہ انسان جب عمل کر لیتا ہے تو عمل فنا نہیں ہوتا بلکہ عمل محفوظ رہتا ہے اور آج تو سائنس نے بھی ثابت کر دیا کہ آواز اور عمل ایک کمرے میں کرنے کے بعد آپ چلے جائیں، پھر بھی اسے ریکارڈ کیا جا سکتا ہے یعنی آپ کی آواز، آپ کی گفتگو اور آپ کا عمل، وہ بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے انکشافات سامنے آ رہے ہیں تو یہ تمام چیزیں ثابت ہیں۔ ظاہری طور پر آپ عمل کر گزرے تو جسم تو فارغ ہو گیا۔ لیکن اس عمل کا ایک خاص اثر اور نتیجہ آپ کی روح پر، آپ کے نفس پر، ہیئتِ نفسانیہ یا خُلق کی شکل میں محفوظ ہے۔ پہلی دفعہ تو آپ کو بے شک باہر سے خیال آیا اور آپ نے وہ عمل کر لیا مگر عمل کرنے کے بعد آپ کے اندر وہ چیز محفوظ ہو جاتی ہے اور کل کو اسی وقت یا کچھ عرصے کے بعد وہی خیال جو آپ کے اندر تھا، اس نے دوبارہ اس عمل پر آپ کو اُکسایا۔ یہ عمل جب آپ بار بار کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، جسے خُلق کہتے ہیں۔ یہ دراصل مجموعہ اعمال کا پیدا شدہ ملکہ ہوتا ہے۔ باہر سے کہیں نہیں آیا۔ اسی کو خُلق کہتے ہیں۔ یہ ہے اَخلاق اور اعمال کا باہمی ربط۔ تو یہ اَخلاق دراصل ہمارے ہی کیے ہوئے اعمال کا مجموعہ یا ملکہ اور خلاصہ ہوتا ہے، جو ہماری روح کے اندر موجود اور محفوظ ہوتا ہے۔

جب یہ خُلق بن گیا تو عادت بن گئی تو عادت بننے کے نتیجے میں آدمی مسلسل اس عمل کو دہراتا رہتا ہے، جیسے اسے نماز پڑھنے کی عادت بن گئی یا روزہ رکھنے کی عادت بن گئی۔ اسی طرح کسی کو اگر گاڑی چلانے کی عادت بن گئی تو مسلسل جتنا وقت زیادہ چلائے گا، اتنا ہی بڑا ماہر بنتا چلا جائے گا۔ جو عمل بھی آپ کرتے رہیں اس دنیا میں، تو وہ اس کی عادت بن جاتی ہے۔ یہ عادات و معروفات انسان کے خیالات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں پھر نئے نئے

خیالات پیدا ہوتے ہیں تو یہ سرکل (circle) شروع ہوجاتا ہے یوں آپ کے نفس میں ایک ہیئت بن جاتی ہے۔ کیونکہ ملاءِ اعلیٰ میں جب آپ نے الست بربکم کہا تھا، یعنی وہاں آپ کی روح موجود ہے، اب دنیا میں جو اعمال کی صورت بنی تو یہ صورت جا کر اُس کے ساتھ متصل (attach) ہوجاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی احادیث نے ثابت کیا کہ جو تمھارے اعمال ہیں، یہی تمھارے لیے جمع کر دیے گئے ہیں اور ان کا شمار کر دیا گیا ہے کہ یہ صورت جب اُس کی روح کے ساتھ اٹیچ ہوتی ہے تو اگر وہ عمل صحیح ہو تو اس کے اوپر اچھا نتیجہ آئے گا اور جزا اچھی آئے گی۔ اور اگر وہ صحیح نہیں ہے تو اس کے اوپر لعنت برستی ہے۔ چنانچہ آپ اچھا عمل کرتے ہیں تو آپ کے دل کو ایک سکون ملتا ہے اور اُنس وطمانیت ملتی ہے۔ مثلاً آپ کسی کی خدمت کرتے ہیں یا کسی کے ساتھ دو جملے اچھے بولتے ہیں، تو دراصل آپ کے اصل انسان کی خوشی کے اثرات آپ کے ذریعے سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور جب آپ کوئی بُرا کام کرتے ہیں تو آپ کا اپنا ضمیر ملامت کر رہا ہوتا ہے کہ یہ بات تو صحیح نہیں ہے۔ یعنی جو کام کیا ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ دراصل اُس صورت کے ساتھ جو عمل کا تعلق پیدا ہوا ہے، اس کے اثرات ونتائج ہیں۔

الغرض اعمال کی جزا وسزا کا تعلق ایک تو نوعِ انسانی کی جبلت سے ہے۔ اسی طرح انسانیت سے متصادم خوراک کھائیں گے تو بیمار پڑیں گے۔ گویا کہ سزا ہے۔ اچھی خوراک کھائیں گے جو واقع میں انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے تو انسانوں کی ترقی کے لیے انعام اور جزا ہے۔ اسی طرح عاداتِ انسانیہ کی بنیاد پر بھی انسان کی جزا وسزا کا تصور ہے۔ ایسے ہی اعمال کی جو صورتِ عالمِ مثال میں ہے، اس کے لحاظ سے جزا وسزا کے اثرات بھی آپ پر مرتب ہونے ہیں اور ملاءِ اعلیٰ کی جزا وسزا کے جو تعلقات ہیں، وہ بھی آپ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تقدیر اور تشریع کا باہم تعلق

یہاں تقدیر اور تشریع کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے یہ اہم بحث بھی حجۃ اللہ البالغہ میں ہے۔

شاہ صاحبؒ نے تقدیر کی عمدہ تشریح کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ ہر چیز کو جب اللہ نے مخلوق کے طور پر پیدا کیا تو اس کے خواص یا اُس کا دائرۂ کار یا اس کی محدودیتوں کا بھی تعین کر دیا۔ اور وہ چیز تبھی بہتر رہے گی جب وہ اپنی اُس محدودیت کے اندر رہے گی۔ اس کو ایک مثال سے شاہ صاحبؒ نے واضح کیا۔ مثلاً شیر پیدا کیا اور اس کی غذا کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ایک بیل، گائے، اونٹ اور بھینس پیدا کی، اس کے لیے بھی کھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ان سب کی محدودیت ہے۔ شیر کی تقدیر یہ ہے کہ گوشت اس کے منہ کو لگا ہے۔ گوشت کھائے گا تو شیر، شیر ہے۔ گھاس کھائے گا تو بیمار پڑ جائے گا۔ بیل اور بھینس چارہ یا گھاس کھائیں گے تو صحت مند رہیں گے۔ انھیں چھچھڑے ڈال دیے جائیں یا گوشت ڈال دیا جائے اور اُن کو کھانے پر مجبور کیا جائے، یہ اُن کی تقدیر کے خلاف ہے۔ تقدیر کا مطلب: ہر چیز کا اپنا دائرۂ کار متعین کر دینا، اُس کے خواص، اس کے اثرات، اس کے اعمال کا دائرہ بنا دینا۔ آپ دیکھئے زمین

کے اندر آپ ایک ہی پوٹیشیم (Potassium) ڈالتے ہیں، فارس فورس (Phosphorus) ڈالتے ہیں۔ پانی دیتے ہیں۔ گوڈی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، ہوا ایک جیسی ہے، پانی ایک جیسا ہے، کھاد ایک جیسی ہے، سب ایک ہیں۔ مگر ایک جگہ پر پودا لگا ہے آم کا، دوسری جگہ پر انگور کا یا سیب وغیرہ کا۔ اب آم کے نفس شجری نے آم کا درخت پیدا کیا اور آم کے درخت کی تقدیر متعین ہوگئی کہ خاص پتے ہوں گے، مخصوص پھل ہوگا، مخصوص ذائقہ ہوگا، مخصوص قد و قامت (height) ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح سیب وغیرہ سمیت ہر درخت کی خصوصیت ہے یعنی یہ جو اس کی قامت یا اس کے خواص یا اُس کی تاثیرات ہیں، یہ اُس کی تقدیر ہے۔

اسی طرح جتنی بھی معدنیات ہیں یا آکسیجن، ہائیڈروجن اور دیگر تمام عناصر (elements) ہیں ان کے خواص، یہ اُن کی تقدیر ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے فرشتے وغیرہ پیدا کیے، ان کی بھی ایک تقدیر مقرر کی کہ:

لایعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون.

(وہ اللہ کے دیے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے، اسے بجالاتے ہیں)

نہ انھیں بھوک لگے گی، نہ پیاس لگے گی، نہ کوئی اَور ضرورت ہوگی۔ یہ اُن کی تقدیر ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں اللہ نے اس کائنات کی تخلیق کے وقت عرش اور ماء (پانی) پیدا کیے، ان دونوں کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے۔ **استویٰ علی العرش** (وہ عرش پر جلوہ گر ہے۔) اور **و جعلنا من الماء کل شیء حی** (پانی سے ہم نے ہر زندہ چیز پیدا کی)

تو پانی کے ارتقا کے مرحلے اور عرش کے تنزلات کے مرحلے آ کر اس حضرت انسان میں آ کر جمع ہوگئے۔ یہ روح اور جسم کا مرکب ہے۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے:

لقد خلقنا الإنسان فی احسن تقویم.

(اور ہم نے انسان کو خوب صورت انداز میں پیدا کیا۔)

دنیا کی کوئی مخلوق اس طرح کی نہیں ہے۔ فرشتے بھی یک طرفہ مخلوق ہیں اور یک طرفہ تقدیر رکھتے ہیں اور اسی طرح تمام حیوانات تک جتنی بھی مخلوقات اس زمین سے پیدا ہوئی ہیں یا پانی کے ارتقا سے آگے بڑھی ہیں، وہ بھی اپنی ایک تقدیر رکھتی ہیں اور اُن کا بھی اپنا ایک دائرہ ہے، جو یک طرفہ ہے۔ حضرت انسان وہ مخلوق ہے کہ جس میں اللہ نے پانی اور عرش کا نور، دونوں رکھ دیئے، یعنی نقطۂ نورانی اور جسم کی حیوانیت یا بہیمیت ترقی کر کے انسانی شکل میں آ گئی، ان دونوں کے باہمی اجتماع سے ایک انسان وجود میں آ گیا۔

اب شریعت کیا ہے؟ شریعت دراصل اس انسان کی تقدیر ہے۔ شریعت آ کر یہ بتلاتی ہے کہ تمھارا جسم حلال کھائے گا یا درست طریقے سے ارتفاقات کی زندگی بسر کرے گا تو تمھاری جسمانی صحت ٹھیک رہے گی اور اگر تم حرام کھاؤ گے یا ارتفاقات کو خراب کرو گے اور دوسرے کو نقصان پہنچاؤ گے تو تمھاری جسمانی صحت بگڑ جائے گی۔ اسی

طریقے سے مَلَکی یعنی روحانی تقاضے ہیں، وہ بھی تم تکمیل پذیر کرو گے تو ملکیت کی طرف روح کی ترقی ہوگی۔ تو شریعت کے قوانین یعنی ملکیت اور روحانیت کی غذا کو مہیا کرنے کی عبادات اور انسانی جسم کی ضرورت پورا کرنے کے ارتفاقات ہیں، یہ دونوں مل کر دراصل اس کی تقدیر ہیں۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ نے سطعات میں کہا ہے کہ: ''تشریع تمہ تقدیر است'' کہ یہ تشریع جو ہے، یہ تقدیر کا تمہ ہے۔ اسی طرح حجۃ اللہ البالغہ میں باب ذکر کیا: باب انشقاق التکلیف من التقدیر کہ تقدیر سے ہی یہ تکلیف یا شریعت کا مکلّف بنانا لازمی اور ضروری قرار پاتا ہے۔ انسان میں ظلمت تھی، اس میں جہالت تھی، تو اس کی جہالت کو ملکیت سے دور کیا اور اس کی ظلمتوں کو ملکیت کے نور سے منور کیا۔ تو شریعت اس کی تقدیر ہے، یہ کوئی غیر فطری چیز نہیں ہے۔ یہ کوئی مسلط کردہ ظلم کی حالت نہیں ہے۔ یہ اس کی تقدیر کا دائرہ ہے۔ یہ اس کا انداز ہے۔

اور یہ بات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس جملے سے بھی واضح ہوتی ہے کہ جب لشکر لے کر شام کی طرف جا رہے تھے تو پتہ چلا کہ جہاں جا رہے ہیں، اُس علاقے میں تو طاعون پھوٹ پڑا ہے اور لوگ مر رہے ہیں تو مجلس مشاورت منعقد ہوئی کہ کیا کرنا چاہیے؟ طاعون زدہ علاقے میں جانا چاہیے یا کچھ عرصہ انتظار کر کے یا واپس پیچھے جا کر انتظار کیا جائے۔ تمام لوگوں کی آراء آنے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے فیصلہ کیا کہ ہم واپس چلتے ہیں۔ جیسے ہی واپس جانے کا فیصلہ کیا تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ امین الامہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے کہ: أنفر من قدر اللہ ؟ کیا ہم اللہ کی تقدیر چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں؟ اگر ہمارے مقدر میں مرنا لکھا ہوا ہے طاعون سے، تو کیوں نہیں ہم آگے بڑھ رہے؟ اس سے کیوں ڈر رہے ہیں؟ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بڑا برجستہ جواب دیا:

نفر من قدر اللہ الیٰ قدر اللہ.

(اللہ کی ایک تقدیر سے نکل کر دوسری تقدیر کی طرف جا رہے ہیں) یعنی ادھر نہ جانا بھی تو تقدیر ہے۔ ایسا کرنا کیا تقدیر سے ہٹ کر ہے؟

تو شریعت کا ضابطہ، دراصل انسان کی تقدیر ہے۔ انسان اپنے جسم کو صحت مند بنانے کے بجائے جسم کو نقصان پہنچانے والا عمل کرنے کی طاقت ہے، کیوں کہ وہ جانور بھی ہے۔ بہیمیت بھی اس کے اندر ہے۔ اب اس کا امتحان یہ ہے کہ یہ جو تمھارے اندر تقدیر تھی شریعت کی شکل میں، تم نے اس پر عمل کر کے اپنے جسم کو صحت مند بنایا ہے یا نقصان دہ؟ نقصان دیا ہے تو اس کی سزا بھگتو کہ تمھارے لیے تقدیر، ملکیت کے اعتبار سے اَخلاقِ اربعہ (طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت) رکھے تھے، کہ تم نے یہ تقدیر پوری نہیں کی کہ اس سے ہٹ کر کرتے رہے ہو۔ اپنی تقدیر سے ہٹ کر جو بھی کرے گا، شیر کرے، جانور کرے، درخت کرے، کوئی بھی مخلوق کرے، اس کو اس کی سزا بھگتنی ہے۔ تو جزا و سزا اسی تقدیر کے ڈسپلن کے توڑنے کا ایک فطری تقاضا ہے کیوں کہ دنیا میں جو بھی مخلوق

ہوگی، وہ محدودیتوں کے دائرے میں ہوگی۔ محدودیت کے دائرے سے ہٹ کر نہیں ہوسکتی۔ جیسے شیر گھاس بھی کھائے، گوشت بھی کھائے، دیگر چیزیں بھی کھائے، ایسا ممکن نہیں ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ان تمام بحثوں کے بعد برّ کی تعریف کی کہ برّ ہر وہ عمل ہے، جو انسانی ارتفاقات کو درست کرے اور جو انسانی ارتفاقات کو خراب کرے، وہ اثم ہے۔ ہر وہ عمل جو اَخلاقِ اربعہ یعنی انسانی سعادت کی کامیابی کے چار اَخلاق طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت کو درست کرے تو ''اَلبِرّ'' ہے اور جو ان کو خراب کرے، ''الاثم'' ہے یعنی ہر وہ عمل جو ملاءِ اعلیٰ کے تقاضوں کے مطابق ہو، نیکی ہے۔ اگر اس سے متصادم ہو تو بدی ہے۔ ہر وہ عمل جس کی اچھی جزا آئے، نیکی ہے اور سزا آئے تو بدی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے نیکی اور بدی کو عمل میں لانے کے بھی بنیادی قاعدے اور ضابطے بتائے ہیں، بلکہ اس برّ اور اثم کی تفصیلات میں برّ کی ایک پوری فہرست دی ہے: توحید، رسالت، فرشتوں پر ایمان، وغیرہ اور طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، ان کی تفصیلات بیان کی ہیں اور جن کو اثم کہا گیا ہے، ان کے مختلف درجات بیان کیے ہیں۔

شعائرِ اربعہ کا تصور

ایک اَور بحث بھی اہم ہے کہ جو شریعت نازل ہوئی تو اس کے چار شعائر ہیں:

القرآن، النبی، الکعبہ، الصلوٰۃ.

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ انسان کا نصابِ تعلیم قرآن ہے۔ اس کا معلم، معلم انسانیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کی تربیت کا مرکز الکعبہ ہے اور کعبہ کے رُخ پر بننے والی وہ تمام مسجدیں جو کعبہ کی بیٹیاں ہیں، وہ اس کی تعلیم و تربیت کا مرکز ہیں اور اس کا عمل یعنی پریکٹیکل، نماز ہے، جو مسجد میں ادا کی جاتی ہے جماعت کے ساتھ۔ جس کے اندر روزے کی حالت بھی ہے کہ کچھ کھانا پینا نہیں۔ طہارت کا خُلق بھی اُس میں شامل ہے۔ عدل اور ڈسپلن بھی ہے کہ امام کی ایک آواز پر اللہ اکبر کہہ کر رکوع اور سجود میں جانا ہے، خواہ تسبیحات مکمل ہوئی ہیں یا نہیں ہوئی ہیں کہ آپ نے جسے امام مان لیا ہے، اس کی امامت کے تحت آپ کو اپنے تمام ارکان مکمل کرنے ہیں۔

اجتماعی رہنمائی کی اہمیت

شاہ صاحبؒ نے سیاست کے بنیادی امور میں یہ بات واضح کی ہے کہ ہر قوم کا سسٹم بنانے کے لیے کچھ رہنماؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ رہنما ذو رأی راشد (درست رائے رکھنے والے) ہوں۔ یعنی ملکیتِ عالیہ اور بہیمیتِ شدیدہ کی اساس پر انسانی سوسائٹی کے عملی نظام بنانے کی اہلیت رکھنے والے رائے کلی یا اجتماعی تقاضوں کو سامنے رکھ کر سسٹم بنانے والے ہوں تو سسٹم اچھا بنتا ہے۔ اور اگر ذو رأی فاسد (ناقص رائے رکھنے والے) ہوں، یعنی انفرادی اور طبقاتی مفادات کے مطابق وہ عملی نظام بنائیں تو بہ ظاہر وہ نیکی اور بدی کا نعرہ ضرور لگائیں گے، لیکن عملی

نظامِ فساد برپا کرنے والا ہوگا۔ تو اچھے رہنماؤں کا انتخاب ہر سیاست کے لیے ضروری ہے کہ جو آپ نے حکومت کے لیے رہنما بنائے ہیں یا جن کو لیڈر بنایا ہے، اس معیار کے مطابق انسان کی ان تمام ضرورتوں پر حاوی ہونے والے رہنماؤں کا انتخاب کرنا ہوگا اور اس کا اعلیٰ ترین درجہ انبیاء علیہم السلام کا اور انبیاء علیہم السلام میں بھی امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔

دوسری بات شاہ صاحبؒ نے کہی کہ جب رہنماؤں کا انتخاب، تو رہنما وہ ہوتے ہیں، جن کے لیے شاہ صاحبؒ نے ایک اصطلاح استعمال کی ہے ''مـفـهّـم''، یعنی سمجھ دار لوگ۔ اور سمجھ دار لوگوں کی سات اقسام بیان کی ہیں کہ سمجھ دار لوگ کون کون سے ہیں؟ جو کسی شعبے کے ماہر ہوتے ہیں۔ مثلاً انسانی نفوس کے تزکیے کے لوگ، انھیں کامل کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو انسانوں کے لیے اَخلاقِ فاضلہ کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں، وہ حکما کہلاتے ہیں۔ جو انسانی سوسائٹی کا سیاسی نظام چلاتے ہیں، انھیں خلیفہ یا حکمران کہا جاتا ہے۔ جو معاشرے کو کسی بڑی مصیبت سے بچانے کے لیے ڈراتے ہیں، انھیں منذر کہا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

شریعت کا تصور اور امام الانبیاء ﷺ کی جامعیت

رہنمائی کی جامع ترین شکل انبیاء کرام کی ہوتی ہے۔ گزشتہ انبیاء علیہم السلام میں ان پانچ چھ امور میں سے کسی کے اندر دو تھے، کسی کے اندر تین تھے، کسی میں چار تھے۔ یہ تمام امور اپنی مکمل ترین شکل میں جس شخصیت میں ہیں، وہ امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور پھر یہ بات بھی واضح کی ہے کہ ہر دور کی ایک شریعت ہوتی ہے اور تمام شریعتوں کا جو دین ہے، وہ ایک ہوتا ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم ﷺ تک، دین ایک ہی ہے۔ دلیل کے طور پر قرآن کی یہ آیت لائے ہیں:

شرع لکم من الدین ما وصی به نوحا و الذی اوحینا الیک و ما وصینا به ابراهیم و موسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین و لا تتفرقوا فیه.

شاہ صاحبؒ نے بڑی وضاحت کے ساتھ البدور البازغہ کے تیسرے مقالے میں بیان کیا ہے کہ کس طریقے سے دین ایک ہے۔ اور پھر ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علاحدہ علاحدہ شریعت رہی۔ **لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا**۔ شریعت کی جو عملی شکلیں ہیں، اس کے جو قوانین ہیں، اس کا جو طریقہ کار ہے، وہ موسوی شریعت میں الگ ہے۔ عیسوی شریعت میں الگ تھا۔ اسی طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں الگ رہا ہے۔ اور اب نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں آ کر اس کی نئی اور مکمل شکل سامنے آئی ہے جو شریعتِ محمدیہ ہے۔ اور پھر اس کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جتنے بھی انبیا حضور ﷺ سے پہلے آئے تھے، یہ قومی نبی تھے۔ صحیح بخاری کی حدیث کے الفاظ ہیں، جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں مجھے خصوصیت کے ساتھ عنایت کی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے

کسی کو نہیں ملیں۔ ان میں سے ایک ہے:

بعثت الیٰ الناس کافة

کہ آپ نے فرمایا مجھے تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے جتنے انبیا ہیں، وہ مبعوث ہوئے ہیں خاص اقوام کی طرف۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ ایک مخصوص قوم کی عادات واطوار کے مطابق جو شریعت ہوتی ہے، وہ ایک محدود دائرے کی ہوتی ہے پھر اس کو ثابت کیا یہودیت اور عیسائیت کی مثالوں سے۔ لیکن جب کل انسانیت کے لیے نظام بنے گا تو کسی ایک جگہ کا تہذیب وکلچر یا کسی ایک قوم کی خصوصیات باقی اقوامِ عالم پر مسلط نہیں کی جاسکتیں۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے ایک بین الاقوامی شریعت کی ضرورت کے مطابق بین الاقوامی قوانین اور ضابطے بتلائے۔ پھر شاہ صاحبؒ نے یہ بات بھی واضح کی کہ سیاست کے اندر لازمی اور ضروری ہے کہ جن امور کے بجالانے کا حکم دیا گیا ہے، اس کی مقدار، اس کے اعداد اور اس کے اوقات متعین کیے جائیں کیوں کہ عام آدمی کسی حکم پر تبھی عمل کرتا ہے کہ جب اُس پر ایک سسٹم کے تحت واضح اور دوٹوک طریقے سے واضح کیا جائے مثلاً نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو نماز کتنی دفعہ پڑھنی ہے، اُس کی ہر دفعہ میں کتنی رکعتیں ہیں اور وہ رکعتیں کیسے ادا کرنی ہیں، قیام کیا ہوگا، رکوع کیا ہوگا؟ یعنی اس کا تمام طریق کار واضح کر دیا جائے۔ یہ اخبات الیٰ اللہ کا عملی ڈھانچہ ہے۔ اسی طرح طہارت کا حکم دیا گیا تو طہارت ایک مبہم لفظ ہے اور اس مبہم لفظ کی واضح تشریح کی گئی کہ طہارت سے مراد کیا ہے۔ کس طرح کا حدث لاحق ہوجائے تو کس طرح کی طہارت کرنی ہے اور اس طہارت کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ کون سے اعضا کہاں کہاں تک، کیسے اور کتنی مرتبہ دھونے ہیں؟ اور بڑا حدث لاحق ہوجائے تو غسل کیسے کرنا ہے؟ اس کے فرائض اور واجبات کیا ہیں؟

اور پھر یہ بات بھی شاہ صاحبؒ نے واضح کی کہ سیاست میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ نتائج حاصل کرنے کے لیے کچھ بنیادی پالیسی اُمور ہوتے ہیں، جن کو ارکان اور فرائض کہا جاتا ہے۔ کسی حال میں جن پر کوئی سمجھوتہ (compromise) نہیں ہوگا۔ وہ ہر ایک کو کرنے ہیں اور کچھ ان کے ممد ومعاون کے طور پر ذیلی اور ضمنی مستحبات یا مسنون عمل ہوتے ہیں کہ اگر کرلیا جائے تو اچھا ہے اور اگر نہ کیا جائے تو کوئی بڑا نقصان نہیں۔ تو ہر قانون میں یہ لچک موجود ہوتی ہے کہ اُس میں کمی وزیادتی پیش نظر رکھی جائے۔

بہرحال سیاست سے متعلق اُمور اور اُن کی مثالیں دے کر ثابت کیا کہ جو چیز نیکی اور بدی ہے، اس کو عمل میں لانے کے پروسیجر (procedure) بنانا سسٹم (system) بنانا، قاعدے بنانا، ایک طریقۂ کار طے کرنا، یہ سیاست کے بنیادی امور ہیں اور اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ اگر کوئی حکم متعین کیا جائے تو اس کی علت (reason) کیسے اخذ کرنی ہے۔ باب الحکم و العلة میں شاہ صاحبؒ نے یہ بحث کی ہے۔ پھر انسانی سوسائٹی کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے لیے قانون ہوتا ہے تو قانون کی آسانیاں کیا ہیں۔ بروقت اگر کوئی کام نہ

ہو سکے تو اس کی قضا اور رُخصت کا کیا طریقہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سسٹم سے متعلق اُمور شاہ صاحبؒ نے اجمالی طور پر جو تمام دنیا بھر کے مذاہب اور قانون سازوں کے ہاں متفق ہیں، وہ واقع کے طور پر متعین کر دیے۔

اور اس کے بعد نبی اکرمؐ کی احادیث کی روشنی میں ان اصولِ مذکورہ یا قواعدِ مذکورہ کی روشنی میں جو دین اسلام کا عملی نظام سامنے آتا ہے، اس کو شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے کہ استنباط حضور ﷺ نے کیسے کیا؟ اس کے جو بنیادی اساسی امور دیے ہیں، وہ کیا تھے؟ دراصل حضور ﷺ کا بنیادی کام ملتِ ابراہیمیہ حنفیہ کے طے شدہ ان قواعد وضوابط کی تشریح تھی۔ جس کو کہا جاتا ہے: فلسفة التشريع الإسلامي. (Philosophy ofIslamic Legislation) اسلامی شریعت دراصل ان مسلمہ قوانین کی عملی شکلیں واضح کرتی ہے۔ یہ بالکل کوئی نئی چیز نہیں ہے اس لیے حضور ﷺ سے کہا گیا:

قل ما كنت بدعا من الرسل.

کہ آپ کہہ دیں میں رسولوں سے ہٹ کر کوئی نئی بدعت یا کوئی نئی بات لے کر نہیں آیا ہوں۔ میں بھی اُسی کی دعوت دیتا ہوں، جس کی دعوت نوح علیہ السلام نے دی، ابراہیم علیہ السلام نے دی، موسیٰ علیہ السلام نے دی۔ تاہم حضور ﷺ نے اس کی عملی جامع و کامل نوعیت واضح کی۔

رسول اللہ ﷺ کی حیثیتیں

شاہ صاحبؒ نے ایک اور بحث تفہیماتِ الٰہیہ میں اور دیگر کتابوں میں کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی بھی دو بنیادی حیثیتیں ہیں: ایک حیثیت سعادتِ قریش، یعنی قومی انقلاب برپا کر کے قریش کی ترقی اور کامیابی کا نظام بنایا جس سے عربوں کی ترقی اور قریش کی ترقی ہوئی اور دوسری ہے آپ ﷺ کی نبوتِ عامہ اور وہ نبوتِ عامہ تمام انسانیت کی تمام اقوام کے لیے ہے۔ اس پس منظر میں فہم حدیث اور قرآن کے حوالے سے اس اہم اور بنیادی بات کی نشان دہی شاہ صاحبؒ نے کی ہے کہ پہلے یہ معلوم ہو کہ جو قرآن کی آیت ہم پڑھ رہے ہیں یا جو حدیث پڑھ رہے ہیں، اس کا تعلق سعادتِ قریش کے مخصوص دائرے سے ہے یا اس کا تعلق نبوتِ عامہ کے دائرے سے ہے؟ ہر بات جو حدیث میں آگئی، اس کو عمومی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ کیوں کہ حدیث میں تو ایسی چیزیں بھی آتی ہیں کہ جو حضور ﷺ کی ذاتِ قدسیہ کے ساتھ خاص ہیں۔ اسی طرح حدیث میں تو ایسی چیزیں بھی ہیں جو صرف قریش کی ترقی اور کامیابی کے حوالے سے مخصوص ہوں۔ اب یہ تعین کرنا اس علم اسرارِ دین کی روشنی میں ضروری ہے کہ سعادتِ قریش سے متعلق اُمور کون کون سے ہیں، جو ایک قومی انقلاب کے لیے ضروری ہیں۔ اور کئی امور کل انسانیت کے بلا تفریق رنگ، نسل، مذہب جو بعثت الی الناس عامة (کل انسانیت کی طرف عمومی بعثت) کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ نے تمام اقوامِ عالم کے لئے الگ الگ تمام قوموں کی خصوصیات سے بالاتر تناظر میں بیان کئے، ان کے مابین فرق کرنا بڑا ضروری ہے۔

متوازن سوچ کی ضرورت

اسی طرح علم اسرارِ دین مجموعی طور پر سامنے ہو اور پھر بات کی جائے تو وہ بات درست ہوتی ہے۔ صرف انسانیتِ عامہ یا نبوتِ عامہ کے نام پر بعض لوگ آج کل خود ساختہ خیالات، بیرون ملک بیٹھ کر چینلوں کے ذریعے سے یہاں پھیلا رہے ہیں، علم اسرارِ دین کا مکمل خاکہ سمجھے بغیر اس کی کوئی ایک آدھ بات لے کر اسے یہ کہنا کہ یہ تو عربوں کی خصوصیات تھیں، اب چونکہ عربوں کی خصوصیات ختم ہو گئیں، لہٰذا باقی لوگوں کے لیے بھی یہ لازمی نہیں ہے۔ حال آں کہ اس کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مکمل علم اسرارِ دین پر فہم و بصیرت حاصل ہو، اس کے تناظر میں آیات اور احادیث، فقہ اور اجماعِ صحابہؓ کو پورے طور پر سمجھا جائے۔ ادھر ادھر سے ساری باتیں کاٹ کر درمیان میں سے کوئی ایک بات شاہ صاحبؒ کی لے کر اپنے خام تصورات کے تحت گفتگو کرنا ہمارے ہاں بڑا المیہ یہی ہے۔ جیسا کہ علی گڑھ کالج کے بانی سر سید احمد خان نے شاہ صاحبؒ کی بات کو درست تناظر میں سمجھے بغیر اصولِ تفسیر میں اسی طرح کی تنقید کی ہے، حال آں کہ وہ بات شاہ صاحبؒ نے کہی ہی نہیں، بلکہ درمیان میں سے عبارت نکال کر اپنی طرف سے تصور قائم کر لیا گیا اور پھر شاہ صاحبؒ کے فلسفے پر اعتراض شروع کر دیے گئے۔ اسی طریقے سے چند دوسرے لوگوں کا بھی یہی معاملہ ہے کہ پورا علمِ اسرارِ دین اور اس کا پورا ڈھانچہ، اس کی بصیرت سمجھے بغیر اس میں سے کچھ چیزیں اپنے من مرضی کی یا جو اُن کی سمجھ میں جتنی آئیں، اس کے مطابق اخذ کر لیتے ہیں۔

اسی طرح آج شاہ ولی اللہ کی آڑ میں کوئی صرف توحید اور شرک کے نام پر فرقہ واریت کے لڑائی جھگڑے پیدا کرتا ہے۔ کوئی شاہ صاحبؒ کے نام پر شیعہ سنی جھگڑے پیدا کرتا ہے۔ اپنے اپنے مذہب اور مکتبہ فکر کے اعتبار سے کوئی شاہ صاحبؒ کو صوفی بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ کوئی موحد بن کر مشرکوں کی گردن اڑانے کے لیے شاہ صاحبؒ کا نام استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کوئی مادیت کو ثابت کرنے کے لیے شاہ صاحبؒ پر الزام تراشی کرتا ہے۔ لیکن اگر شاہ صاحب کا یہ مکمل علم اسرارِ دین اور اس کا پورا خاکہ سامنے ہو اور اس کی اساس پر فہم و بصیرت موجود ہو تو یقیناً سوسائٹی کی ترقی کے بہت سارے پہلو واضح ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں علم اسرارِ دین کو جامعیت کے ساتھ سمجھنے اور اس کے مطابق اپنے فکر و عمل کے گوشوں کو روشن کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين!

سوالات و جوابات

سوال

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک بات فرمائی ہے کہ یہ چیز مجھ پر منکشف ہوئی۔ الفوز الکبیر میں بھی انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے۔ اور آپ کی زبانِ فیض ترجمان سے بھی یہ الفاظ ادا ہوئے کہ ہزار سال تک، یہ روایت بالمعنی ہی کہیں گے کہ کسی نے یہ کام نہیں کیا۔ تو یہ شاہ صاحبؒ کا جو اونچا مقام ہے، اس کے اعتبار سے بہر حال تمام لوگوں کے لیے قبول ہے۔ مگر جب کسی بنیاد پر جب ہم یا کوئی اور آدمی چھوٹے میدان میں کوئی ایک بات کہتا ہے یا کرتا ہے تو ہمارا جو اعتراض ہوتا ہے اس پر تو وہ یہ ہوتا ہے کہ چودہ سو سال تک کسی کو یہ بات سوجھی نہیں ہے۔ یہ اس کو ہی سمجھ آئی ہے۔

تو اس پس منظر میں مَیں جاننا چاہوں گا۔ آپ نے جو کچھ ارشاداتِ عالیہ سے مستفید فرمایا تو وہ پہلے جو اٹھان تھی ساری کی ساری، آخر میں آکر دو چار لوگوں پر تنقید کر کے ختم ہوئی۔ ان لوگوں کو بھی آپ موقع ہی نہیں، بلکہ حق دیں کہ وہ اپنی رائے پیش کریں۔ رائے پر تنقید ہو سکتی ہے، لیکن ہم ایک نقطہ نظر پر ان کو اپنا پابند بنانا چاہتے ہیں تو یہ علم کی موت ہے۔ تو اس حوالے سے ذرا وضاحت فرما دیں۔

جواب

کل کی گفتگو میں مَیں نے یہ بات عرض کی تھی کہ علوم جتنے بھی ہیں، وہ بعد میں مرتب اور مدوّن ہوئے ہیں، مثلاً امام بخاریؒ نے احادیث مرتب و مدون کی ہیں، حضور ﷺ کے دو ڈھائی سو سال بعد۔ اسی طریقے سے احناف، مالکی اور شافعی حضرات نے فقہ مرتب کی۔ یہاں تک کہ عربی زبان کی گرائمر کے قاعدے ضابطے بھی بعد میں آئے ہیں۔ ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کے مطابق علوم کا دنیا میں نزول ہوا اور اس کے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اب حضور ﷺ کے زمانے میں تو قرآن پاک بھی ایک جگہ پر جمع نہیں کیا گیا۔ بعد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ضرورت پیش آئی تو اس کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ بعد میں ضرورت پیش آئی تو احادیث مرتب ہو گئیں۔ اسی طرح علم اسرارِ دین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے کہ علوم القرآن اور علوم الحدیث کا ایک جمع و تدوین کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد اگلا زمانہ اس کی چھان پھٹک کا تھا، اُس کے مشکل جملوں کی تشکیل کا تھا، مشکل الحدیث اور غریب الحدیث پر کام کرنے کا تھا اور پھر اس کے بعد فقہ الحدیث کا، جس میں فقہا نے احادیث کے جو فقہی اور جزوی اور قوانین اور ضابطے ہیں، ان پر کام کیا۔

اب اس زمانے میں ضرورت پیش آئی کہ اس سے آگے بڑھ کر جو دنیا بھر کے دیگر فلسفے ہیں، اور دیگر مذاہب ہیں، ان کے تناظر میں اور جو اس وقت علوم عقل، نقل اور کشف کے ذریعے سے آئے ہیں، ان تمام کو یک جا کر کے دین اسلام کو اس تناظر میں انسانیت کے سامنے رکھنا چاہیے، چناں چہ اس دور کی ضرورت کے تقاضوں کے تحت شاہ صاحب نے یہ علم اسرارِ دین مرتب اور مدوّن کیا۔

اور پھر چوں کہ خود شاہ صاحبؒ نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ آخر مجھے کیوں یہ ضرورت پیش آئی؟ شاہ صاحبؒ نے تفصیل سے اس بات کا جائزہ لیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ اس علم، اس کے اصول، قاعدے، ضابطے اور اشارات قرآن میں بھی موجود ہیں، احادیث میں بھی موجود ہیں۔ اسی طریقے سے صحابہؓ کے اقوال میں بھی موجود ہیں۔ تاریخ میں کچھ علما، جن میں امام غزالیؒ، علامہ خطابیؒ وغیرہ شامل ہیں، نے بھی تذکرہ کیا، یہ بکھرے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کو ایک علم وفن کی صورت میں ترتیب دے کر میں نے لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔

ایک مربوط ڈھانچے کے تحت علم اسرارِ دین ان تینوں دائروں سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں عقل کا استعمال بھی ہے۔ نقل کا استعمال بھی ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ علم کا تیسرا اور اہم ترین ذریعہ کشف بھی سامنے ہے۔ یعنی یہ علم تینوں چیزوں کی اساس پر ہے۔ میں نے اس سے پہلے لیکچر میں ان تینوں دائروں پر بحث اور گفتگو کی تھی اور شاہ صاحبؒ کی خصوصیت یہی بیان کی تھی کہ خالی کشف یا انکشاف نہیں ہے کہ بیٹھے بیٹھے کوئی خیال آ گیا اور شاہ صاحبؒ نے اٹھ کر اس پر کام شروع کر دیا۔ بلکہ عقل، نقل اور کشف یعنی تینوں کی بنیاد پر، حقائق کائنات کے کچھ واقعی امور اور ان کے قاعدے ضابطے مرتب کیے اور پھر اُس کی روشنی میں جو سسٹم بننا چاہیے تھا، اس سسٹم پر شاہ صاحبؒ نے گفتگو کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ رائے کے اختلاف کا تو ہر ایک کو اختیار ہے۔ عیسائی کو بھی اختیار ہے، یہودی کو بھی اختیار ہے۔ ہم اس کا انسانی حق سمجھتے ہیں کہ وہ اختلافِ رائے کرے۔ لیکن جو اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے شاہ صاحبؒ کے ساتھ یا کسی خاص مفکر کے ساتھ پھر اُس کی ایک بات لے لے اور باقی باتیں چھوڑ دے۔ تو یہ درست نہیں۔

اگر آپ شاہ ولی اللہؒ کو عصری حوالہ سے معیار مانتے ہیں، شاہ صاحبؒ کا نام لیتے ہیں اور شاہ صاحبؒ کے نام پر بات چیت اور گفتگو کرتے ہیں تو شاہ صاحبؒ کی پوری بات لینی چاہیے، جیسے کسی نے میرا مؤقف لینا ہے تو میری پوری بات سنیں گے تو پتہ چلے گا۔ یہ نہ ہو کہ شاہ صاحبؒ کا نام لیں اور اُن کی ادھوری بات لے لیں اور اگر آپ شاہ صاحبؒ کو چھوڑ کر کوئی نیا فکر بنانا چاہتے ہیں تو ضرور بنائیں۔ آپ کا یہ انسانی حق ہے کہ آپ رائے قائم کریں، لیکن دلائل کی بنیاد پر۔ ظاہر ہے کہ جواب میں ہم بھی اپنے دلائل قائم کریں گے۔ پھر بات چیت اور گفتگو ہوگی۔ یہاں تو بات چیت اس بنیاد پر ہو رہی ہے کہ شاہ صاحبؒ کو ہم مسلمہ شخصیت مان رہے ہیں لہٰذا ادھوری بات نہیں ہونی چاہیے۔ ادھوری بات کوئی بھی لے اور اُس پر تنقید کرے، تو وہ رویہ درست نہیں۔ جامع طور پر شاہ صاحبؒ کے مکمل فکر و فلسفے کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جائے تو ٹھیک ہے، خوش آمدید۔

سوال

آپ نے شاہ صاحبؒ کے عالم مثال کے حوالے سے بات کی۔ یونانی فلاسفہ کے ہاں بھی انسانیت کا ایک فلسفہ موجود ہے۔ شاہ صاحبؒ کے عالم مثال کا اس سے کیا فرق ہے؟

جواب

بات یہ ہوتی ہے کہ علوم لوگوں پر آتے ہیں۔ کسی پر عقل کے راستے سے آئے، کسی پر کشف کے راستے سے آئے اور کسی پر انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کے واسطے سے آئے۔ ہم جب کسی کو غلط قرار دیتے ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ یہ مکمل طور پر ہی غلط ہے۔ حال آں کہ دنیا میں جتنے حکما، فلاسفر یا سائنس دان یا رہنمایانِ قوم ہوتے ہیں، وہ سو فی صد غلط ہوں تو رہنما نہیں بنتے۔ اُن کے پاس علم کا ایک ڈھانچہ ضرور ہوتا ہے۔ علم کی کچھ بنیادیں ہوتی ہیں۔ غلط فہمی یا اُس کو دوسرے تناظر میں سمجھنے کی کوئی کمی ضرور ہوسکتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے توجہ دلائی ہے کہ گزشتہ جتنے بھی حکما گزرے ہیں، وہ دراصل اپنے اپنے دور کے انسانوں کے رہنما ہیں۔ ہوا یہ کہ جب انبیاءؑ کی اصلی تعلیمات میں تحریفات ہوئی ہیں، اور ان کی تاویلات میں اختلاف ہوگیا۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات، یہودیوں نے تبدیل کردیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے اندر اُن کے ماننے والوں نے تبدیلیاں کردیں اور تثلیث کا نعرہ لگادیا۔

اور جب قرآن یہ کہتا ہے کہ **و لکل قوم هاد** اسی طرح ارشادِ خداوندی ہے **و إن من أمة الا خلا فيها نذير** - کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہم نے کوئی ڈرانے والا یا نبی نہ بھیجا ہو۔ تو ممکن ہے کہ افلاطون اپنے دور کا نبی ہو اور اُس نے بھی اُسی منبع سے فکر لی ہو، جس منبع سے انبیا علیہم السلام لے رہے ہیں لیکن مرورِ زمانہ یا تحریف در تحریف سے اس کی تعبیرات کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آئے ہوں۔

تو اب اگر قرآن اُس کی تصدیق کررہا ہے، یا احادیث اس کو مان رہی ہیں یا اس کے حوالے سے اس کی وضاحت کررہی ہیں، تو اب یہ کہنا کہ اس کا ضرور فرق نکالو افلاطون سے، پھر تو آپ سچے ہیں، ورنہ تو آپ بھی افلاطونی ہیں۔ تو یہ غیر علمی اور غیر سائنٹفک رویہ ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے جو بڑے بڑے اوتار رام، کرشن وغیرہ آئے ہیں، ان کے بارے میں مرزا مظہر جانِ جاناں جیسی معتبر علمی و صوفی شخصیت نے کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی انبیاءؑ ہوں لہٰذا ان کو بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔ ظاہر ہے یہ حضور ﷺ سے پہلے کے ہیں۔ تو ان کی تعلیمات بھی بعد میں تحریف در تحریف سے گزر کر آج ہمارے سامنے دیوی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں یا افسانے بن کر رہ گئے۔ تو اب اگر افلاطون نے عالم مثال دریافت کیا اور عالم مثال پر اُس نے گفتگو کی ہے۔ اور اس پر افلاطون کے شاگردوں نے اس کی تشریحات و تعبیرات کی ہیں۔ تو اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہم تک روایت در روایت ہوتے ہوئے کیا وہی تھیں، جو افلاطون کے تصور میں آئیں؟

سوال

آپ نے بتایا کہ عمل کے پیچھے خیال ہیں اور خیال کے پیچھے ایک پورا سسٹم ہے۔ جبلت کے بارے میں آپ نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنائی کہ پہاڑ تو تبدیل ہوسکتا ہے، لیکن انسان نہیں۔ اگر وہ بُرا ہے تو جبلتاً بُرا ہے۔ تو اس میں انسان کا شرف ووقار کیسے ہوا؟ گویا انسان کو تو مجبورِ محض پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے؟ اس کا حل کیا ہے؟

جواب

دیکھیں! یہ سوال جب صحابہؓ نے حضور ﷺ سے کیا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

اعملوا فکل میسّر لما خُلق لهٗ.

یعنی تمہارا کام عمل کرنا ہے، عمل کرتے رہو اور اس عمل کے مطابق نتائج نکلیں گے۔ دراصل جبلت کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو وہ ہے جو غیر متبدل ہوتا ہے اور ایک پہلو وہ ہے، جو ریاضت، مجاہدے اور اپنے ارادے کے فیصلے کرنے کے نتیجے میں اس کے اندر تغیر وتبدل آتا ہے۔ اسی لئے تو ہم مشق یا نظام بنانے یا ماحول پیدا کرنے کی بات کرتے ہیں۔ مثلاً ہم نے تعلیمی نظام بنایا، ہم نے تعلیمی ماحول مہیا کیا ہے اور اس کے لیے کچھ معیارات طے کیے ہیں کہ جو لوگ اس کو پڑھ کر نکلیں گے، اور اتنے نمبر لیں گے، وہ پاس ہوجائیں گے۔ اور جو اتنے نمبر نہیں لیں گے، وہ فیل ہوجائیں گے۔ اگر انسان میں یہ تغیر وتبدل نہ ہوتو پھر تو یہ نظامِ تعلیم ہی نہیں ہونا چاہیے۔ یونیورسٹیاں بھی نہیں ہونی چاہئیں۔ ملک بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ریاست بھی نہیں ہونی چاہیے۔ پھر جیسا اللہ میاں ہمارے ساتھ معاملہ کرے گا، ویسا ہوجائے گا۔ حال آں کہ اس جبلت کو بدلنے کے لیے ہم مدرسہ بھی کھول کر بیٹھے ہوئے ہیں، مسجد بھی، یونیورسٹی بھی، کالج بھی، لیکن جب دین کا معاملہ آئے اور دین کے اعمال کی بات آئے تو وہاں ہم جبلت کی بنیاد پر کہہ دیتے ہیں کہ مقدراں دی کھیڈ اے (مقدر کا کھیل ہے) اس لیے یہ دو متضاد رائے بھی نہیں ہونی چاہئیں۔

بات یہ ہے کہ جبلت کا ایک پہلو وہ ہے، جو تربیت سے بدل جاتا ہے۔ اب دیکھیں ایک جاہل آدمی تھا، اس کو آپ نے تربیت دی تو وہ عالم بن گیا۔ اس کے اندر ایک مہارت پیدا ہوگئی اور ملکہ پیدا ہوگیا۔ ایسے ہی دین کے علوم کا بھی معاملہ ہے کہ جیسے انسان میں آدمی استعداد نکھارتا ہے، اس کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے تو اس کے اندر وہ علوم منتقل ہوجاتے ہیں۔

سوال

آپ نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ہیں علوم کے لیے: عقل، نقل اور کشف۔ مگر کشف کی حقیقت صرف وہی شخصیت جان سکتی ہے۔ اس کی تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ تو ایسی چیز کو جب ہم دین کی تفہیم کا ایک ذریعہ مان لیں گے، تو پھر یہ کیسے طے کرپائیں گے کہ فلاں بندے نے کشف بیان کیا ہے، وہ درست ہے اور فلاں

بندے کا بیان کردہ کشف درست نہیں۔

اور دوسری بات یہ کہ آپ نے کہا کہ عقل بھی تفہیم کے لیے ضروری ہے اور نقل بھی، اور کشف بھی، تو اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو دین آیا تھا، اس میں ان ساری چیزوں کا حصہ کس حد تک تھا اور انسانی کشف کی حیثیت ہے؟ تو اصل میں یہ سمجھنا ہے کہ کیا کشف کے ذریعے سے کوئی بات بیان ہو گی یا عقل کے ذریعے سے جو چیز آئے گی، وہ اس دین سے زیادہ ہو گی جو ہمیں نبی اکرم ﷺ سے ملی۔

جواب

یہ تمام سوالات جو کشف پر ہیں، یہی سوالات عقل پر بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ عقل کس کی معیاری ہو گی؟ ایک کی عقل ایک بات کہہ رہی ہے، دوسرے کی دوسری بات کہہ رہی ہے، تیسرے کی عقل اس سے مختلف کہہ رہی ہے تو یہ سوال تو ہم عقل پر بھی اٹھا سکتے ہیں کہ آپ کی عقل کے مطابق ایک چیز ثابت ہے تو دوسرے کے لیے کیوں حجت ہو؟

ایسے ہی احادیث آپ کے پاس منقول ہو کر آئی ہیں۔ ایک ہی راوی ہوتا ہے۔ اس پر ایک ناقدِ حدیث اس کو کذاب یا دجال تک کہہ دیتا ہے اور اُسی راوی کو دوسرا مجتہد کہتا ہے کہ اس سے بڑا نیک بندہ کوئی نہیں اور وہ عادل ہے تو وہاں اجتہادی رائے کا ایک ہی نقل کے بارے میں، ایک ہی راوی کے بارے میں فرق آجاتا ہے۔ اس لیے یہ تو ایک اصولی بات ہے کہ یہاں ہر آدمی کے کشف، ہر آدمی کی عقل یا ہر آدمی کے نقل کی بات نہیں ہو رہی۔

بات تو یہ ہو رہی ہے کہ علم کے یہ تین ذرائع ہیں اور جو اس کے اہل افراد معیاری طور پر رہے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ ترین درجہ انبیا علیہم السلام کا ہے۔ وہ مسلمہ شخصیات ہیں۔ ان کی عقل بھی، ان کی نقل بھی اور اُن کا کشف بھی، تینوں ہی معتبر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی صحابہ ؓ ہیں، تابعینؒ ہیں، یا وہ اولوالعزم مجددین ہیں، جن کے اندر یہ کیفیت رہی ہے۔

عقل کے حوالے سے ہمارے ہاں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ دین کے اندر عقل کا کوئی دخل نہیں۔ دین تو خالصتاً بس اللہ نے اوپر سے ایک حکم نامہ بھیج دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نعوذ باللہ، ایک ڈاک پہنچانے والے کی حیثیت سے بند لفافہ قرآن کی شکل میں پاس آیا اور انھوں نے اس کو کھول کر لوگوں کر پڑھ کر سنا دیا۔ قطعاً ایسا نہیں!

معتبر کشف عقل کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ جو نقل صحیح ہوتی ہے، وہ بھی عقل سلیم کے مطابق ہوتی ہے۔ جب آپ ﷺ کی جسمانی قوت ستر مردوں سے زیادہ ہے تو آپ ﷺ کی عقل بھی بہت اونچے درجے کی ہو گی۔ جب اتنی بڑی عقل تھی تو آپ نے اتنے بڑے علم کو اپنے اندر ضبط کیا اور اتنے ہی اونچے اور بہت ہی بہتر طریقے سے لوگوں تک اُسے منتقل کر کے دریافت کیا کہ: کیا میں نے تمھیں پیغام پہنچا دیا؟ یعنی میں نے "نقل" پوری پوری لوگوں تک پہنچا دی؟

تینوں چیزوں کا ثبوت قرآن میں موجود ہے: افلا تعقلون، افلا تشعرون کہہ کر قرآن نے بار بار عقل کی دعوت دی ہے۔ شعور کی دعوت دی ہے اور اسی بنیاد پر انبیاء علیہم السلام کو ماننے کی دعوت دی ہے۔ اور ظن وگمان، یعنی ان

انتم الا تخرصون وغیرہ کی تردید کر کے جو دوٹوک اور قطعی بات ہے، وہ اگر کسی پر منکشف ہوئی ہے تو وہ انبیاء علیہم السلام ہی کی بات ہی حجت ہوگی۔ اصل بنیاد تو وہی ہیں۔ کسی ولی کا کشف دوسرے پر حجت نہیں ہوتا۔ وہ حجت تبھی بنے گا کہ اُس کشف کے ساتھ نقل صحیح کی بھی حجت موجود ہو اور اس کے ساتھ جو عقل سلیم ہے، وہ بھی اس کے ساتھ مؤید ہو۔ اسی لیے محض کشف ہو اور باقی دو نہ ہوں، تو تب بھی نقص ہے۔ صرف عقل اور باقی دو نہ ہوں، تب بھی نقص ہے۔ اور خالی نقل ہو اور عقل اور کشف دونوں نہ ہوں، تب بھی کمزوری اور نقص ہے۔

جامع ترین اولوالعزم رہنمایانِ قوم، ان تینوں ذرائع علم کو استعمال میں لاتے ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہی نہیں کہ یہ تینوں چیزیں ہر آدمی کے لئے لازمی اور ضروری ہیں۔ جملے کی تعبیر میں فرق ہے کہ تینوں ذرائع علم ہیں، جس کے پاس یہ تینوں ہیں، وہ رہنما بنتا ہے۔ اور جس میں یہ ذرائع علم استعمال کرنے کی طاقت یعنی عقلی طور پر بھی سمجھانے، نقلی طور پر بھی سمجھانے اور کشفی طور پر بھی سمجھانے کی اہلیت ہوگی، وہ نتیجہ پیدا کرے گا۔ وہ درست ہے۔

سوال

آپ نے کہا کہ ہر دور کے علمی تقاضے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی شخصیت ان علمی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر بھی اپنا علمی فلسفہ تشکیل دے رہی ہوتی ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حوالے سے کوئی شک نہیں کہ بڑا ذہن ہے۔ لیکن وہ بھی تو ایک دور اور ایک عرصے کی پیداوار ہیں۔ آج دور کے تقاضے بدلے ہوئے ہیں۔ تو آج کے کسی اور صاحب کو یہ حق کیوں نہیں ہے کہ وہ اپنے تقاضوں کے حساب سے جو سمجھا ہے، وہ بیان کرے، وہ شاہ صاحبؒ کا پورا فلسفہ کیوں بیان کرے؟

جواب

کل اس پر گفتگو ہوئی تھی کہ شاہ صاحبؒ نے انسانی سوسائٹی کا تجزیہ کیا۔ اور تجزیے میں تین باتیں رکھی گئیں تھیں: فکری انتشار کا ہونا، سیاسی عدمِ استحکام اور طبقاتی نظام کا ہونا یعنی امیر کا امیر سے امیر اور غریب کا غریب سے غریب تر ہونا۔ سوسائٹی کے ڈھانچے میں جو بنیادی انتشار کی حالت ہندوستان میں 1762ء میں تھی، اب تو دو سو سالہ غلامی کے نتیجے میں مزید گہری ہوئی اور آج پاکستان کے ستر سال گزرنے کے باوجود وہ مزید گنجلک ہوتی چلی گئی۔ کیا دور کے ان حالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟ ہم نے شاہ صاحبؒ سے لے کر اب تک کے دو ڈھائی سو سالہ دورانیے میں اپنی حالت بدل کر ایک نئے ماحول اور اُس کے حوالے سے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے کہ اب ہمیں ایک نئے سسٹم اور نئے نظامِ فکر و عمل کی ضرورت پیش آ رہی ہے؟ پہلی ضرورت تو یہی ہوگی کہ جس کی اساس پر مسائل کے حل کرنے کا ایک جامع نظام دیا گیا، پہلے اُس پر تو گفتگو ہو۔ اس چیز کو تو درست کر لیا جائے۔ وہ درست ہو جائے تو آگے بڑھ کر ضرور اگلے جو تقاضے ہیں، اُن کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس دوڈھائی سو سالہ دور میں علمی حوالے سے اگر ارتقا ہوا ہے تو فلسفۂ مادیت میں ہوا ہے۔ مادی فلسفے میں جدید یورپ نے سرمایہ داری کے ماتحت یا سوشل اِزم کے ماتحت نئی چیزیں تخلیق کی ہیں۔ نئے پیداواری ذرائع سامنے آئے ہیں۔ نئے سسٹم اور پروسیجر طے ہوئے ہیں۔ یعنی تجرباتی اور مشاہداتی بنیاد پر کام ہوا ہے۔ جب کہ نقل کی اساس پر ان چیلنجز کو حل کرنے یا کشف کی اساس پر ان مسئلوں کو حل کرنے یعنی دین کی اساس پر بنیادی کام کرنے کے حوالے سے نہیں ہوا ہے۔

اور اس بات کے کہنے کی اجازت دیجیے کہ انگریزوں کے تسلط کے بعد سے لے کر اب تک کے اس ڈیڑھ سو سالہ دور میں چاہے مسجدوں اور مدرسوں کا عمل ہو، یا اس سے باہر ہو، مذہب کی تعبیرات کے حوالے سے یا یورپ کے اثرات یا اُس کے مادی فلسفے سے متاثر ہونے کے نتیجے میں چیزیں سامنے آئی ہیں یا ردِ عمل کی کیفیات کے ساتھ آئی ہیں یا دفاع کے نقطہ نظر سے کچھ چیزوں کا دفاع کرنا ہے اور اس تناظر میں کچھ جزئیات لے لی جائیں اور باقی چیزیں چھوڑ دی جائیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ردِعمل کی نفسیات سے ہمیں باہر نکلنا چاہیے اور ہمیں اس تناظر سے بھی باہر نکلنا چاہیے کہ ہمیں ہر حال میں دوسروں کو فتح کرنا ہے۔

ہم جب دین اسلام کی بات کرتے ہیں تو دین اسلام کا جو جامع فکر و عمل امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مرتب اور مدوّن کیا اور اُن کے بعد آنے والے جو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں، انھوں نے اس جامعیت کو برقرار رکھا، جس میں مسائل کے حل کا جو راستہ ہے، اس پر کوئی اثر انداز نہیں ہوا، یورپین مادی تحریک یا مادی خواہشات کا کوئی غلبہ نہیں لہٰذا کم از کم اُس کو ہم مطالعے کا ذریعہ بنائیں مگر ہم مسلط کسی پر نہیں کرتے۔ شاہ صاحبؒ نے البدور البازغہ کے آخر میں لکھا ہے کہ میں اپنے ماننے والوں کو کہتا ہوں کہ وہ اپنی بات کو کسی کے اوپر طاقت کے بل بوتے پر مسلط نہ کریں۔ جو نہیں مانتا اُس کو آزادی ہے۔ ہم اُس کی آزادی کا احترام کرتے ہیں۔ جو مانتا ہے تو ٹھیک ہے، اُسے سکھائیں اور سمجھائیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہمارے مسائل کے حل کرنے کے لیے علومِ قرآنیہ، علومِ حدیثیہ، علومِ فقہیہ، فلسفہ، سیاست، سماج اور معاش وغیرہ ان تمام پہلوؤں پر جامعیت کے ساتھ جتنی بھی گفتگو ہے، وہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد سے لے کر اب تک کسی نے اتنی جامعیت کے ساتھ نہیں کی۔ اس لیے اس پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ اس کو سیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایک نشست یا چند مجالس میں تو ہم شاہ صاحبؒ کا مکمل فکر و فلسفہ نہ پڑھ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تو ابھی ایک تعارفی سلسلہ ہے۔ تو جب ہم اس کو ایک مستقل بنیاد بنا کر پڑھیں گے تو یقیناً سوچ کے زاویے بدلیں گے۔ چیزیں مزید نکھریں گی۔ مزید سوالات ہوں گے، اُن کے ذریعے سے مزید نتائج سامنے آئیں گے۔

صدارتی کلمات

پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالرحیم

چیئرمین شعبۂ عربی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

الحمد للّٰہ الّذی خلق الإنسان و علّمهٔ البیان. و الصّلوٰۃ و السّلام علیٰ من اوتی جوامع الکلم و حسن البیان. و علیٰ آلہٖ و صحبہٖ و من تبعهٔ بإحسان. قال اللّٰہ تعالیٰ: إنّا انزلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون. (القرآن) صدق اللّٰہ العظیم.

رئیس قسم العلوم الاسلامیه سابقاً الدکتور سعیدالرحمن و الأخ الشّیخ المفتی عبدالخالق آزاد نقول بالعربیة الحرّ، یعنی المفتی عبدالخالق الحُرّ رائے بوری. و الإخوان و الأخوات. الطّلّاب و الطالبات، و الباحثین و الباحثات! احییکم تحیّة طیبة مبارکة من عنداللّٰہ و أقول السلام علیکم و رحمة الله و برکاتهٔ.

قبل هٰذہ الجلسة سعادة الدکتور سعیدالرّحمٰن هاتفنی و اتصل بالهاتف و قال لی أنا أکلّفک کرئیس لهٰذہ الجلسة العلمیة المبارکة و هٰذہ الجلسة العلمیة لیس بحسب، بل نقول هٰذہ الجلسة فکریة و فلسفیة و هٰذا شیء جدید. لأنا نتحدث عن فلسفة شاہ ولی اللّٰہ. ماشاء اللّٰہ وفی هٰذہ الجلسة نحن سمعنا هٰذا الشّیخ المفتی عبدالخالق و هو ألقیٰ المحاضرة بأسلوب ممیّز و أن هٰذہ المحاضرة کانت جامعة و شاملة.

سب سے پہلے میں ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر پہلے ہی فون کیا تھا کہ آپ آئیں یہاں پر صدارت کریں، میں نے کہا: میں تو اس کا اہل نہیں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ نحن نجعلک أهلاً۔ ہم آپ کو اہل بنا دیتے ہیں۔ اب آپ دیکھ لیں کہ میں اہل ہوں یا نہیں ہوں۔ تو میں نے پھر بڑوں کی بات مانتے ہوئے یہاں پر آ گیا ہوں۔ تو میرے لیے یہ ایک خوشی اور سعادت کا موقع ہے۔ بڑی خوشی ہوئی مجھے اس سے۔ اور خاص طور پر یہ جو شعبۂ علومِ اسلامیہ کا ایک سلسلہ چل رہا ہے محاضرات کا مختلف ٹاپکس پر، یہ بہت نہایت مفید اور فائدہ مند ہے کیونکہ طالبِ علم کچھ کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے، کچھ لائبریریوں سے حاصل کرتا ہے، کچھ یہ محاضراتِ عامہ ایک خاص طرز اور جامع ہوتے ہیں، تو اس سے بھی بہت زیادہ علم حاصل کرتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ جب ہم طالبِ علم تھے، اُس وقت حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ کی کتاب کا نام ہم سنتے تھے۔ اُس وقت بھی عام آدمی، عام مدرّس یا عام عالم نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس کو پڑھانے والے خاص قسم کے استاد تھے۔ آپ نے نام سنا ہوگا ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ کا، وہ اس کے بڑے ماہر تھے اس کتاب کے، بڑے شوق سے پڑھاتے تھے طلبا کو اور ٹائم بھی دیتے تھے۔ جب چاہیں، جس طرح چاہیں، جس وقت چلے جائیں اُن کے پاس، وہ پڑھانے کے لیے تیار ہوتے تھے۔

میں نے بچپن میں سنا، وہ تھے مولانا محمد صدیق، منڈی یزمان کے رہنے والے تھے۔ اور فکرِ ولی اللّٰہی پر اُن کے پاس بڑا مطالعہ اور بڑی کتابیں اُن کے پاس تھیں۔ اُن سے بھی ہم کبھی کبھی یہ باتیں سنا کرتے تھے۔ اور میرا حجۃ اللہ البالغہ سے بھی تھوڑا سا تعلق یہ ہے کہ ہمارے ہاں شعبۂ عربی میں بھی پڑھائی جاتی ہے، اس کا باب الخلافۃ ہمارے ہاں پڑھایا جاتا ہے۔ اور میں ہی پڑھا رہا ہوں۔ عقد الجید فی مسئلۃ الاجتهاد و التقلید۔ شاہ صاحبؒ کی ایک کتاب ہے بڑی مشہور، یہ چھوٹا سا ایک کتابچہ ہے۔ اور بڑا مفید اور بہت علمی ہے۔ شاہ صاحبؒ کا ایک قصیدہ بھی ہے: اطیب النغم فی مدح سیّد العرب و العجم

آج مولانا صاحب نے ہمیں حجۃ اللہ البالغہ کا ایک دو گھنٹے میں ایک نقشہ پیش کر دیا۔ بلکہ نہ صرف حجۃ اللہ البالغہ کا، بلکہ فلسفہ شاہ ولی اللہ، فکرِ شاہ ولی اللہ، وہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اسی سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک آدمی کا سو سال کا مطالعہ ایک طرف، مگر ایک صاحبِ علم کے ساتھ ایک گھنٹے کی مجلس زیادہ حاوی ہے اور مفید ہے۔ جیسے آج ہم نے دیکھا کہ کتنا ہم نے استفادہ کیا اور ہمیں فائدہ اس سے حاصل ہوا۔ مولانا صاحب نے جو ڈسکشن کی، یہ بھی بہت اچھی بات ہوئی۔

جو یہ کشف کا لفظ موضوعِ بحث بن رہا تھا، کشف کا کوئی ایسا خطرناک معنی نہیں ہے، کشف کا معنی ہوگا کھلنا۔ وہ چیزیں جو پیچھے سے چلی آ رہی تھیں، بکھری ہوئی تھیں، اُن کو سمیٹنے کا آئیڈیا اور خیال کھل کر سامنے آ گئی ہیں۔ مطلب ہے کہ کوئی ایسی نئی چیز نہیں ہے، جس سے ہم خوف زدہ ہوں کہ شاہ ولی اللہ سے پہلے جو چیزیں تھیں، جیسے مولانا صاحب نے اشارہ کیا عزالدین عبدالسلامؒ کا اور خطابیؒ کی طرف کہ اُنھوں نے جزوی طور پر ان پر کام کیا ہے۔ ہمیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر، جو خاص طور پر ماہرینِ علومِ اسلامیہ ہیں، اُن کو تو خاص طور پر یہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ کیوں کہ علومِ اسلامیہ بالخصوص اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا اقتصادی نظام، اسلام کا معاشرتی نظام، وہ شاہ ولی اللہ کے فکر کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں اسلام کا سیاسی نظام اور اقتصادی نظام اور معاشرتی نظام، یہ اختیاری مضمون کے طور پر ہیں۔ لیکن یہ اختیاری مضمون کے طور پر نہیں ہونے چاہئیں، ان کی بہت اہمیت ہے۔ ان کو لازمی مضمون کی حیثیت دینی چاہیے۔

مولانا صاحب بات کر رہے تھے جبلت کی۔ جبلت ایک فطری چیز ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے جبلت النفوس علیٰ الذکور، یعنی انسان کی خواہش یہ ہے کہ بیٹا ہو۔ خواہش اُس کی یہی ہے۔ مگر بیٹی ہو جاتی ہے تو سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ لیکن خواہش اُس کی ختم نہیں ہوتی۔ جبلت نہیں ختم ہوگی۔ اُس کی تمنا رہے گی۔ وہ فطرت، فطرت ہی ہوتی ہے۔ وہ بدلتی نہیں، لیکن بعض چیزیں اعمال کی وجہ سے جو صفات ہیں، اَخلاق ہیں، بدل جاتی ہیں۔ اُن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو نہ بدلنے والی چیزیں ہیں، وہ اَور ہیں اور جو بدلنے والی چیزیں ہیں، اَور ہیں، اس کو تبدیل (modify) کیا جا سکتا ہے۔

میں اسی کے ساتھ پھر دوبارہ سب حضرات کا شکریہ ادا کروں گا اور آخر میں مولانا صاحب کا بھی کہ اُنھوں نے بہت اچھے علمی اور مدلل انداز میں پریزنٹیشن اور لیکچر دیا۔ بہت ہی متاثر کن اور بہت ہی زیادہ مؤثر تھا۔ خاص طور پر مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اور آپ کو بھی یقیناً فائدہ ہوا ہوگا اور میں نے آج سے ارادہ کر لیا ہے کہ میں بھی اگلے لیکچرز میں بہ طور سامع کے آؤں گا۔ ان شاءاللہ۔

اسی کے ساتھ میں سب حضرات کا، ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب کا، اور تمام منتظمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اخیراً أدعوا الله تعالیٰ ان یوفقنا جمیعا لخیر و سعادۃ و السلام علیکم و رحمۃ الله و بر کاته.

تیسرا لیکچر

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت

مؤرخہ 19 / اپریل 2017ء بروز بدھ

صدارت

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا

سابق چیئرمین شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

نظامت

پروفیسر ڈاکٹر محمود سلطان کھوکھر

شعبہ علومِ اسلامیہ، زکریا یونیورسٹی، ملتان

تلاوتِ کلامِ پاک

محمد ارشد محمود

ایم فل سکالر

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

عدنان بخاری

بی ایس علومِ اسلامیہ

تیسرا لیکچر

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہِ الکریم. اما بعد! فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ: و لقد مکّنّاکم فی الأرض و جعلنا لکم فیھا معایش، قلیلا ما تشکرون. (القرآن) و قال النّبیّ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم: "اُطلبوا الرّزق من خبایا الأرض." و قال النّبیّ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم: "الاقتصاد فی النّفقۃ نصف المعیشۃ." صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہٗ النّبیّ الکریم.

معاشیات کی اہمیت

صاحبِ صدر اور معزز اساتذہ، طلبا و طالبات، خواتین و حضرات!

حضرت الامام شاہ ولی دہلویؒ کے علوم و افکار کے حوالے سے آج ہمارا موضوع معیشت جیسے اہم مسئلے پر گفتگو کرنا ہے۔ معاشیات اور اقتصادیات اس دور کا بڑا سلگتا ہوا موضوع ہے اور بالخصوص اس حوالے سے بھی کہ یورپ کے دنیا بھر پر قبضے کے بعد معاشیات واقتصادیات کے تصورات زندگی کے باقی تمام زاویوں پر غالب ہو چکے ہیں۔ علم و فکر بھی معاشی اور اقتصادی سرگرمیوں کے تابع ہے، سیاست بھی سرمائے کے گرد گھومتی ہے، مذہب بھی اس کے گھر کی لونڈی بن چکا ہے۔ غور و فکر اور سوچنے کے سوتے بھی سرمائے کے تابع ہو چکے ہیں۔ الغرض معاشی سرگرمیوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، بلکہ کسی علم و فکر، ملک، فرد، قبیلے، قوم، بلکہ اقوامِ عالم کا جائزہ بھی معاشی حوالے سے ہی جاتا ہے۔ اس دور میں جب کہ معاشی اور اقتصادی معاملات ہر چیز پر چھا چکے ہیں، ایسے میں دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں علمی اور فنی طور پر اقتصادی امور یا معاشی علوم پر غور و فکر کرنا انتہائی اہمیت رکھتا ہے اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا میں معاشی حوالے سے جن دو نظاموں نے اس وقت دنیا کے ایک سو نوے سے زائد ملکوں پر

بالادستی حاصل کی ہوئی ہے، وہ کیپٹل ازم کی شکل میں ہو یا کمیونزم کی کی صورت میں، دونوں انکار مذہب کی اساس پر اپنا سیاسی اور معاشی نظام تشکیل دینے کے دعوے دار ہیں۔ اور اُن کے خیال کے مطابق سوسائٹی تبھی ترقی کرتی ہے، جب مذہب کا انکار کیا جائے اور خالصتاً معاشی نقطہ نظر سے یا سیاسی نقطہ نظر سے معاشروں کو دیکھا اور پرکھا جائے اور اُن کے مسائل کے حل کرنے کے لیے مادی نقطہ نظر یا دولت اور سرمائے کے تناظر میں تمام امور سرانجام دیے جائیں۔

اہل دین کی ذمہ داری

ایسے ماحول میں اہل مذہب کے سامنے دو راستے ہیں کہ یا تو وہ مذہب چھوڑنے کا اعلان کریں یا مذہب کی اساس پر سوسائٹی کے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل پیش کریں۔ دیگر مذاہب یہودیت، عیسائیت، ہندومت، بدھ مت اور آتش پرست وغیرہ مذاہب کے ہاں اگر کسی زمانے میں کوئی سیاسی و معاشی تصورات تھے بھی تو وہ تو آج پسپا ہو گئے۔ انھوں نے قبول کر لیا کہ گرجا ہمارا، سیاست آپ کی۔ مندر ہمارا، معیشت آپ کی۔ آتش کدہ ہمارا، باقی سب آپ کا۔ انھوں نے اس تقسیم کو قبول کر لیا۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے یہودی ہیں، عیسائی ہیں، ہندو ہیں، بدھ ہیں یا کچھ اور ہیں، وہ چند مذہبی رسومات یا عبادات سرانجام دے کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ ایک ہفتے بعد، مہینے بعد یا جیسے بھی اُن کے ہاں پرارتھنا یا مذہبی سروس کا کوئی تصور موجود ہے، لیکن سیاسی اور معاشی معاملات میں وہ ان دونوں نظاموں میں سے کسی ایک نظام، بلکہ زیادہ تر کیپٹل ازم یا سرمایہ داری نظام کے تابع ہیں۔ مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا وہ اپنی یہ حیثیت مذہب کے حوالے سے اس تناظر میں قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اور کیا جس دین سے وہ وابستگی کا اعلان کرتے ہیں، وہ انھیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ عبادت تو خدا کی ہو اور سیاست اور معیشت سرمائے کی ہو اور دین سے ہٹ کر ہو۔

پھر یہودیت کی حکمرانی کا دور سوڈیڑھ سو دو سو سال ہے۔ عیسائیت کا بھی ایسا ہی کچھ سو سال ہے۔ بدھوں کا یا ہندوؤں کے ویدک دھرم کا بھی بہت تھوڑا سا عرصہ ہے۔ جب کہ مسلمانوں نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے کوئی گیارہ بارہ سو سال تک۔ پورے افریقا، یورپ کے بڑے حصے اور پورے ایشیا پر دین اسلام کے ماننے والوں نے نظام قائم کیے، دنیا بھر کے لوگوں کے اقتصادی اور معاشی مسائل حل کیے، سیاسی نظام بنائے اور کم از کم حکمرانی کے چار ادوار خلافت راشدہ، خلافتِ بنواُمیہ، خلافتِ بنوعباس اور خلافتِ بنوعثمان، کے دوران حکومتوں کے ماتحت عملی سیاسی، معاشی نظام تشکیل دیے۔ گویا ان تمام گیارہ بارہ سو سالہ دور میں معاشی نظام بھی وجود میں آئے اور سیاسی معاملات بھی بنے۔

مسلم برصغیر کا معاشی نظام

2001ء میں اقوامِ متحدہ نے ایک معاشی سٹڈی کرائی کہ 1101ء سے لے کر 2001ء تک کے ہزار سالہ دورانیے میں دنیا بھر کے تمام ممالک میں معیشت کے گراف کی نوعیت کیا تھی؟ سات خطوں میں جو جغرافیائی تقسیم

کے اعتبار سے ہے، پوری دنیا کو اس ہزار سالہ دور میں تقسیم کیا گیا۔ چناں چہ جو دنیا بھر میں معاشی اعداد و شمار اقوامِ متحدہ کے آرکائیو میں موجود ہیں یا دنیا بھر کے مخطوطات کی شکل میں اقوامِ متحدہ کے علم میں ہیں، ان کی روشنی میں ایک کام کیا گیا۔ انگس میڈیسن (Angus maddison) کی سربراہی میں کمیٹی بنی اور اس نے ایک سٹڈی کی، اقوامِ متحدہ کی ویب سائٹ پر وہ کتاب موجود ہے: ''ہزار سالہ معیشت کا جائزہ'' (A The World Economy Millennial Perspective) اس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان دنیا کی نمبرون (No.one) معیشت تھی۔ پیدائش دولت، تقسیم دولت، تبادلہ دولت اور صَرفِ دولت کے اصول پر معاشیات کے جو بنیادی پیرامیٹرز (parameters) ہیں، اس کی روشنی میں آج سے پہلے کا دوسو سالہ دور وہ ہے، جس میں ہندوستان دنیا کی نمبرون معیشت ہونے کی وجہ سے یورپ میں یہ ''سونے کی چڑیا'' (Golden Sperow) کے عنوان سے مشہور تھا۔ معاشی ترقی کا یہ عمل بغیر کسی معاشی سسٹم کے نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی معاشی نظام کے تحت ہی معاشی نشو و نما ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی معاشی حالت کیا تھی؟ وہ بھی سب کے سامنے ہے اور یہاں مسلمانوں کے آنے اور ان کے نظامِ حکومت اور معیشت کے قائم ہونے کے نتیجے میں وہ دنیا کی نمبرون معیشت بنا۔

جس دین اسلام نے معاشی تعلیمات بیان کی ہیں، اس کے اصول اور ضابطے بتلائے ہیں، قرآن حکیم کی تعلیمات معاشی حوالے سے واضح اور دوٹوک ہوں، نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات ہوں، احادیثِ مبارکہ کا ذخیرہ ہو، فقہا کی فقہی جزئیات، خرید و فروخت، لین دین، معاشی امور کی قانونی صورتوں سے بھرے ہوئے ہوں اور اس کا عملی نظام بھی موجود رہا ہو۔ کیا اس کے ماننے والے اس بات پر قناعت کرنے پر تیار ہیں کہ وہ صرف نماز اللہ کی پڑھیں گے مسجد میں یا انفرادی طور پر اور روزہ، حج اور زکوٰۃ دیں گے، یعنی عبادت کرنے میں وہ آزاد ہوں، لیکن سیاسی اور معاشی معاملات میں وہ اس دور کے مادی نظام ہائے حیات کو قبول کرنے کے لئے تیار رہیں اور خرید و فروخت اور لین دین و دیگر قوانین نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات سے ہٹ کر ہوں؟ یقیناً یہ بات درست نہیں ہے۔

اسلام اپنا ایک مستقل معاشی نظام رکھتا ہے، اس کا ایک فلسفہ معیشت ہے، وہ معاشی قوانین اور ضابطے بیان کرتا ہے اور اسی کی اساس پر ایک عملی نظام بناتا ہے۔ یہ گفتگو کرتے ہوئے آج اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بالمقابل جو نظام ہائے حیات ہیں، ان کا موازنہ (comparison) بھی پیش کیا جائے۔ کیوں کہ یک طرفہ بات سے تو معاملہ واضح اور دوٹوک طور پر سامنے نہیں آتا۔ یعنی دین کا فلسفہ معیشت، سرمایہ داری اور سوشلزم کا فلسفہ معیشت کا باہم موازنہ کیا ہے؟ ایسے ہی انھوں نے علم معیشت کے جو بنیادی اساسی امور ہیں، تعریفات، موضوع اور غرض و غایت اور اس کے بنیادی قواعد و ضوابط متعین کیے ہیں، وہ کیا ہیں؟ اور دین اسلام اس حوالے سے کیا تعلیم دیتا ہے؟

شاہ صاحب کی معاشی فکر میں تجدیدی حیثیت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ وہ عظیم مفکر ہیں، جنھوں نے اس تناظر میں دین اسلام کا ایک مکمل معاشی سسٹم واضح کیا ہے اس زمانے میں، جب کہ ابھی نہ موجودہ سرمایہ داری کی پیدائش ہوئی تھی اور نہ سوشلزم کی۔ شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ لکھی ہے 1735ء میں۔ 1733ء میں شاہ صاحبؒ حرمین شریفین سے ہندوستان واپس تشریف لائے۔ اور اس کے دو تین سال کے عرصے میں شاہ صاحبؒ نے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ کیوں کہ 1736ء میں شاہ صاحبؒ نے ہمعات لکھی اور اس میں حوالہ دیا ہے کہ جو ان علوم پر میری بحث پڑھنا چاہتا ہے، وہ حجۃ اللہ البالغہ پڑھ لے۔ اور اس کا جو مخطوطہ دستیاب ہے بلکہ اب تو وہ مطبوعہ بھی ہے، اس کے آخر میں تاریخ لکھی ہے 1147ھ۔ اس حساب سے شاہ صاحبؒ نے تقریباً 1735ء میں یہ کتاب تحریر فرمائی ہے۔ اور 1736ء تک یہ ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔

ایڈم سمتھ (1790ء) نے ''دولتِ اقوام'' (The Wealth of Nations) لکھی جو 1776ء میں پہلی دفعہ سامنے آئی۔ یعنی حجۃ اللہ البالغہ کے تقریباً چالیس سال بعد اور کارل مارکس (1883ء) نے اینگلز (1895ء) کے تعاون سے 1848ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو (Manifesto of the Communist Party) لکھا جبکہ اس نے داس کیپٹل (Das Kapital) لکھی ہے 1857ء اور اس کے آس پاس جس میں کیپٹل پر بحث کی۔ 1867ء میں سب سے پہلے جرمن زبان میں اس کی پہلی جلد سامنے آئی جبکہ دوسری جلد 1885ء میں اور تیسری جلد 1894ء میں شائع ہوئی۔ اور 1887ء اور اس کے بعد اس کے انگلش اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہوئے جیسے عربی میں ترجمہ ہوا ''رأس المال'' کے نام سے وغیرہ۔

آپ دیکھئے کہ کارل مارکس نے جو نظریہ معیشت کا دیا ہے، اس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے اور ایڈم سمتھ کی کتاب سے تقریباً چالیس سال پہلے شاہ صاحبؒ نے کتاب لکھی۔ اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ایڈم سمتھ کا زمانہ مرکنٹائل اِزم کا زمانہ ہے کہ تجارتی نظریۂ زر، یعنی زر کی اساس پر معیشت کی گردش کا زمانہ ہے۔ کیپٹل کی اساس پر نہیں۔ ارتقا کے اگلے مرحلے میں جب صنعت سامنے آتی ہے اور قدرِ زائد پیدا ہوتا ہے تو کیپٹل وجود میں آتا ہے اور یہی اگلے دور میں داخل ہوتا ہے۔

علم معیشت کا دائرہ کار

معاشی اصطلاحات میں اگر ہم بات کریں تو علم معیشت کی تمام تر گفتگو کے دو ستون ہیں، معاشیات ان کے حوالے سے بات کرتی ہے: نمبر ایک یہ کہ انسانی احتیاجات کا تعین۔ انسان کو حاجت ہے کھانے پینے کی، گرمی سردی سے بچاؤ کی یعنی اپنی جسمانی ضرورتوں اور احتیاجات کی تسکین۔ گویا احتیاجات کا ایک کالم (column) بنا دیا۔ اور

پھر اس میں بحث ہے کہ خواہش کیا ہے اور حاجت کیا ہے؟ یہ مستقل بحث ہے۔ بہر حال جو حاجات ہیں، ان کا قرار واقعی ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد دوسرا کالم (column) ان احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل کی دستیابی کا ہے۔ وسائل موجود ہوں گے تو اس سے کسی نہ کسی انسانی ضرورت کی تکمیل ہوگی۔ وسائل معاش ایک تو قدرتی ہیں اور دوسرا اُن وسائل معاش میں انسان محنت کے ذریعہ ایک انفرادیت پیدا کر کے ایک افادیت (utility) پیدا کرتا ہے۔ وہ افادیت کسی نہ کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کردار ادا کرتی ہے۔

واضح ہو کہ انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے بالترتیب چار چیزوں کی ضرورت ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ایڈم سمتھ سے بھی چالیس سال پہلے ان چاروں کو علاحدہ علاحدہ بیان کیا۔ ارتفاقات کی بحث میں جہاں معاشیات پر بحث کی اور بالخصوص البدور البازغہ میں، شاہ صاحبِ نے حکمتِ اکتسابیہ، حکمتِ تعاونیہ، حکمتِ تعاملیہ اور حکمتِ منزلیہ کے عنوانات سے انھیں تعبیر کیا ہے کہ (۱) دولت کی پیدائش کے اصول اور ضابطے کیا ہونے چاہئیں؟ (۲) اس پیدا شدہ دولت کو عوامل پیدائش دولت (Factors of Production of Wealth) پر کیسے تقسیم کرنا ہے یعنی تقسیم کے اصول کیا ہوں گے؟ (۳) اسی طریقے سے خرید و فروخت اور لین دین میں سے کون سی بیع اور تبادلہ جائز اور درست، جب کہ فاسد اور باطل کون سا معاہدہ ہے اور دونوں کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس کی حکمت (logic) کیا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے خرید و فروخت کے قوانین اور ضابطے بھی متعین کیے۔ (۴) اور پھر اس کے استعمالات بھی قرآن نے واضح کیے کہ کیسے اور کہاں دولت صرف کرنی چاہیے؟

ان متعلقہ امور کو ایڈم سمتھ نے اپنی کتاب ''دولتِ اقوام'' میں پیدائش دولت Production of Wealth۔ پھر پیدا شدہ دولت کی تقسیم Distribution of Wealth۔ پھر تقسیم شدہ دولت کا تبادلہ یعنی خرید و فروخت اور بیع، لین دین، اس کے اصول اور ضابطے اور قاعدے جب کہ تقسیم شدہ اور پھر تبادلہ شدہ دولت کے استعمال Consumption of Wealth کے عنوانات سے ذکر کیا ہے۔

سرمایہ داری نے یا ایڈم سمتھ نے مرکنٹائل دور (mercantilism) کے تقاضوں کے مطابق، ظاہر ہے کہ اس کے زمانے میں وہی تھی، اس پر گفتگو کی ہے۔ اور جیسے جیسے وقت گزرا، تو سرمایہ داری کیمپ کے بعد میں آنے والے ماہرین معاشیات نے اسی تناظر میں اس کے انھیں پہلوؤں کو آگے بڑھا کر مزید تفصیل و تشریح واضح کی۔ اسی کو بنیاد بنا کر کارل مارکس نے گفتگو کی ہے۔ چوں کہ ایڈم سمتھ کے اس نظریے سے سرمایہ کا تصور وجود میں آیا کہ اس نے پیدائش دولت کے عمل کے تناظر میں سرمائے کی اور دولت کی اہمیت پر گفتگو کی۔ اس لئے داس کیپٹل میں مارکس نے علمی، فنی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے اور ریاضی اور الجبرا کے قوانین کی روشنی میں، حتیٰ کہ اپنے خاندانی یہودی مذہب، یعنی تورات کے تناظر میں بھی اس نے کیپٹل کی اس قرار واقعی حیثیت کو، جو ایڈم سمتھ نے مقرر کی تھی، دلائل کے ساتھ

توڑا اور منطقی بنیادوں پر ردّ کیا۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ان دونوں سے پہلے ان چاروں پہلوؤں پر اسلام کی تعلیمات کو جمع کرتے ہیں۔ انہوں نے کتابِ مقدس قرآن حکیم کی متعلقہ آیات اور احادیث مبارکہ کے ذخیرہ کو مربوط طور پر واضح کیا۔

ایڈم سمتھ کی نظر میں معیشت

ایڈم سمتھ جب معیشت کی تعریف کرتا ہے تو کہتا ہے کہ علم معاشیات وہ علم ہے، جس میں انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے موجود دولت سے بحث کی جاتی ہے۔ اقوامِ عالم میں دولت اقوام (wealth of nations) کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی اس نے دولت کو بنیاد بنایا ہے اور احتیاجات پر کوئی بحث نہیں کی کہ واقعی اور حقیقی احتیاجات کون سی ہیں؟ اور پھر ان احتیاجات کی تسکین کا نظام (procedure) کیا ہو؟ اس کی پوری کتاب میں کوئی بحث نہیں۔ کیوں کہ اس کا موضوعِ بحث یہ ہے کہ دولت زیادہ سے زیادہ کیسے پیدا کی جائے؟ دولت زیادہ سے زیادہ اکٹھی کیسے کی جائے؟ دولت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیسے ممکن ہے؟ وغیرہ چوں کہ مرکنٹائل دور، زر (monetary) کے اکٹھا کرنے کا ہے، اس لیے سب سے بڑا اُس نے اصول دیا کہ دنیا میں مرکزی حیثیت زر کی ہے۔ اس لیے ہمیں اگر طاقت ور بننا ہے تو زر کو اپنے پاس رکھنا ہے۔ اس نے اس کا قانون اور ضابطہ بتلایا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کا زر، سونا چاندی تھا۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کے زر ہونے کی حیثیت کی زری حقیقت ونوعیت یا زری پالیسی پر بھی جامع گفتگو کی ہے کہ یہ سونا کیسے زر کے طور پر وجود میں آیا۔ زر، کو قومی اور اجتماعی نقطۂ نگاہ سے جمع کیا جائے۔ باہر اس کی گردش روک دی جائے۔ باہر مال جانا چاہیے، جب کہ زر آپ کی طرف آنا چاہیے۔

ایڈم سمتھ کے ہاں پیدائش دولت، تقسیم دولت، تبادلہ دولت اور صرفِ دولت کے جو معیارات ہیں، اس کی اساس ارتکازِ زر ہے اور اسی زر کو اکٹھا کرنے کے لیے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان آئی تھی۔ سونے کی چڑیا (Golden Sperow) کا عنوان اُن کے ہاں اسی لئے مشہور ہوا کہ ہندوستان کے پاس بڑا سونا ہے۔ شاہ جہان کے زمانے میں یہاں کا سب سے بڑا سکہ ایک سو پانچ تولے سونے کا تھا، جسے مہر شاہی کہا جاتا تھا۔ سونے کی پرکھ اور اس کی بہتر حالت کو زیادہ مرتب اور مربوط انداز میں آئین اکبری میں اکبر بادشاہ نے واضح کیا ہے اور اسی تناظر میں زر کی تشکیل اور اس کی ٹکسالی حیثیت دنیا میں سب سے زیادہ ہندوستان میں مشہور تھی۔ ایڈم سمتھ کے اسی نظریے کے تحت ہی انگریز زر اکٹھا کرنے کے لیے یہاں آئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اسی اصول پر بنی۔ گویا کہ ان کے ہاں زر کے گرد تمام چیزیں گھومتی رہیں۔

اور صنعتی دور کے آنے کے بعد زر کو اگلے مرحلے میں سرمایہ (capital) قرار دیا گیا، یعنی جب پیداوار بڑھی اور اُون کی تجارت، نیل کی تجارت، اور اسی طریقے سے آگے بڑھ کر صنعتی ترقی کے نتیجے میں جونئی سے نئی چیزیں

تیار ہوئیں، وہ باہر جائیں مگر زر وہیں رہے۔ یہ بنیادی پالیسی رہی سرمایہ داری نظام میں۔ اس کی سرمایہ داری نظام میں یہی اساس رہی جو ایڈم سمتھ نے متعین کی، اور اس کے بعد بھی جتنے بھی ماہرین معاشیات آئے ہیں، انھوں نے دولت کے گرد ہی نظریات پیش کیے۔ گو مارشل نے اپنی کتاب ''اصول معاشیات'' مطبوعہ 1890ء میں تھوڑی سی کوشش کی کہ احتیاجات کو بھی ساتھ داخل کرلیا جائے۔ کیوں کہ اعتراضات شروع ہوگئے کہ یہ تو اَخلاقیات سے ماورا محض دولت سمیٹنے کا عمل ہے، جو انسانیت دشمنی کی بات ہے۔ تو اُس نے اپنی تعریف میں کسی قدر احتیاجات کو بھی ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مرکز اور محور دولت ہی رہی۔

مارکس کا نقطۂ نظر

اسی طریقے سے کال مارکس نے جتنی بھی گفتگو کی ہے، وہ بھی اسی مطمح نظر سے ہے۔ اس نے یہ کہا کہ یہ دولت آپ دیتے ہیں سرمایہ دار یا صنعت کار کو انفرادی ملکیت میں، جب کہ دولت کی انفرادی ملکیت کی بجائے ریاستی ملکیت ہونی چاہیے۔ گویا سرمایہ ختم نہیں ہوا یا دولت ختم نہیں ہوئی، بلکہ نقطہ نظر بدل گیا کہ کمیونزم میں دولت کا یہ اجتماع ریاست کے اِرد گرد ہونا چاہیے۔ جو قدرِ زائد بھی آیا ہے، وہ محنت اور مزدوروں کی وجہ سے ہے۔ اور اسی کی اساس پر پرولتاریہ کا تصور (concept) مارکس نے پیش کیا۔ اس نے کہا کہ چوں کہ یہ اجتماعی کاوش سے یا مزدوروں کی اجتماعی کوشش سے یہ دولت پیدا ہوئی ہے، اس لیے اس کی مالک ریاست ہے۔ یا وہ انقلابی پارٹی جو مزدوروں کی آمریت کی اساس پر ہو، وہ اس دولت کے بارے میں فیصلہ کرے۔

علم معاشیات اور شاہ صاحب کا جامع نظریہ

اب اس تناظر میں آپ شاہ صاحبؒ کی تعریف پڑھیے۔ البدور البازغہ میں شاہ صاحبؒ نے بڑی جامع و مانع تعریف کی ہے۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ آج ہماری معاشیات کی کتابیں اسلامی معاشیات کے نام سے بہت کچھ بیان کرتی ہیں، لیکن آپ کو کسی کتاب میں شاہ صاحبؒ کی یہ تعریف نہیں ملے گی۔ شاہ صاحبؒ نے تعریف ذکر کی:

''الحکمة المعاشية ان تستوفی حواجک علیٰ مراعاة مقتضیٰ الأخلاق الفاضلة من الديانة والسمت الصالح وغيرهما، ومقتضى العلوم التجربية، والرّأى الكلى.

شاہ صاحب کی اس تعریف کے مطابق معاشیات دو کالموں پر استوار ہے: انسانی احتیاجات اور ان احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل معاش، وہ خواہ زر کی شکل میں ہوں، اجناس کی شکل میں ہوں، یا کسی اُور حالت میں ہوں۔ یہ وسائل معاش، ضرورت پوری کریں۔ سردی سے بچاؤ، کپڑا لتا کھانا پینا وغیرہ جو بھی ہو۔ ان حاجات کی تسکین مقصد ہے۔ معاشی علم یا اقتصادی علم کا ہدف یہ ہے کہ انسانی احتیاجات کی تسکین ہو۔ لہٰذا سب سے پہلے تو احتیاجات کے تعین کا ایک معیار ہونا چاہیے۔ اگر ہر انسانی خواہش کو حاجت قرار دیا جائے تو ہر انسان کے اندر تو معاشی

حوالے سے خواہشات کی نوعیت یہ ہے ہر خواہش پہ دم نکلے تو ہر خواہش تو پوری نہیں کی جا سکتی۔ احتیاجات کے تعین کا ایک معیار (criteria) ہونا چاہیے۔ ایسے ہی وسائل کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور اُس کا صَرف، اس کا بھی کچھ معیار طے ہونا چاہیے کہ پیدائش کس اصول پر ہوگی؟ اس کی تقسیم کس اصول پر ہوگی؟ اس کا تبادلہ کس اصول پر ہوگا؟ اس کا صَرف یا استعمال کیسے ہوگا؟ شاہ صاحبؒ نے کہا: وہ تین چیزیں ہیں۔

(۱) شاہ صاحب نے کہا کہ: عرب وعجم، دنیا بھر کے تمام مذاہب اور دنیا بھر کی تمام ملتوں کا جائزہ لو۔ جن اَخلاقِ فاضلہ پر دنیا متفق ہے، آزادی اور حریت، شجاعت اور بہادری، عفت وعصمت وغیرہ وغیرہ، شاہ صاحبؒ نے فلسفہ یونان سے لے کر اپنے زمانے تک کے تمام فلسفیوں اور تمام مذاہب کی تعلیمات، بدھ اِزم، یہودی، عیسائیت، اسلام کے تناظر میں جو اَخلاقِ فاضلہ متعین ہو سکتے تھے ممکنہ طور پر، البدور البازغہ میں وہ سات بنیادی اَخلاقِ فاضلہ متعین کیے ہیں (حکمت، عفت، سماحت، شجاعت، فصاحت، دیانت، اور سمت صالح) اور شاہ صاحبؒ نے کہا کہ مہذب انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے جو بھی اَخلاقِ فاضلہ ہیں، ان کو احتیاجات کے تعین میں بھی اور وسائل کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور صَرف میں بھی پیش نظر رکھا جائے کہ وہ تمام قوموں میں متفقہ ہیں۔

(۲) ان دونوں چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاشی سسٹم بناتے ہوئے دور میں جو ٹیکنالوجی، جو تجربات، جو مشاہدات سے نئے نئے علم دریافت ہوئے ہیں، ان علوم کو بروئے کار لایا جائے۔ خواہ وہ کسی دور کی کوئی ٹیکنالوجی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے ذرائع پیداوار یا پیداواری رشتے مسلسل ارتقا پذیر رہے ہیں۔ ایک پتھر کا دور ہے، جس میں صرف قدرتی وسائل کی بنیاد پر معیشت وجود میں آتی ہے۔ پھر غلام داری دور آیا، پھر فیوڈل اِزم یا زمین کی اساس پر تمام پیداواری رشتے وجود میں آئے۔ فیوڈل اِزم کے بعد مرکنٹائل اِزم آیا جب تجارت اور خرید وفروخت کی بنیاد پر زر اور پیسے کا استعمال شروع ہوا۔ اور پھر بڑھتے بڑھتے دیگر ارتقا کی شکلیں سامنے آئی ہیں۔ تو شاہ صاحبؒ نے کہا کہ جو بھی کسی دور کی ٹیکنالوجی دریافت ہو چکی ہو، چیزوں کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور استعمالات کے حوالے سے یا انسانی احتیاجات کے حوالے سے، ان کو پیش نظر رکھا جائے۔ مثلاً ایک غلام داری دور کے انسان کی حاجت ہے اور ایک آج کے دور (Digital Age) کے انسان کے حاجت ہے۔ تو دونوں حاجتوں میں فرق ہوگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج کا انسان پیچھے زمانے کو دوبارہ لوٹ کر اُسی زرعی معیشت کے دور میں زندگی بسر کرنے کے معیارات کے مطابق اپنی حاجت پوری کرے۔ ایک زمانے میں مثلاً موبائل فون کوئی حاجت نہیں تھی، آج حاجت ہے۔ تو علوم تجربیہ، یعنی ٹیکنالوجی کی نئی دریافتوں سے جو نئی ضرورتیں یا احتیاجات سامنے آتی جائیں، اُن کی روشنی میں دولت کی پیدائش بھی ہوگی، تقسیم بھی ہوگی، تبادلہ بھی ہوگا۔ اور اس کے استعمالات کے ضابطے اور قوانین بھی بنائے جائیں گے۔

(۳) تیسری بات شاہ صاحبؒ نے کہی کہ الرأی الکلی کہ یہ احتیاجات اور ان کی تقسیم کے پیدا شدہ مسائل یا

پیدائش کا عمل سوسائٹی کے اجتماعی مفادِ عامہ کے تناظر میں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ ایک آدمی اپنی حاجت اور ضرورت پورا کرنا چاہتا ہے انفرادی طور پر تو اس کی حاجت اور ضرورت پوری کرنے سے باقی اجتماع کو نقصان پہنچتا ہے مثلاً وہ کوئی ایسی فیکٹری، کارخانہ بناتا ہے، جس کی آلودگی مثلاً سوسائٹی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ یا وہ ایسے طریقے سے کاروبار (business) کرتا ہے کہ باقی ریاست کے تمام لوگوں کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ یا زراعت اور کاشت کاری ایسے کرتا ہے، جو باقیوں کے لیے نقصان کا باعث ہے۔

شاہ صاحبؒ کی یہ اصطلاح ہے الرأی الکلی اور الرأی الجزئی۔ (کل ان شاء اللہ ارتفاقات کی بحث میں اس پر مستقل گفتگو کی جائے گی) رأی کلی، میں مفادِ عامہ یا اجتماعیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور رأی جزئی وہ ہے جو انفرادی نقطہ نظر سے انفرادی مفادات، ذاتی مفادات اور گروہی مفادات کے تناظر میں آگے بڑھتی ہے۔ اس لئے شاہ صاحبؒ نے کہا کہ احتیاجات کی تسکین کو بھی پورے معاشرے کے مجموعی مفاد کو سامنے رکھ کر متعین کیا جائے گا۔ کسی خاص فرد، طبقے یا نسل یا خاص فرقے کی اساس پر احتیاجات کا تعین نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کی تسکین کا طریقۂ کار ایک مخصوص طبقے کے مفادات کے تناظر میں تعیش کی بنیاد پر ہوگا، بلکہ اجتماعی مفادِ عامہ کے تناظر میں ہوگا۔ گویا یہ تین معیارات ہیں۔ پہلا اَخلاقِ فاضلہ، دوسرا علومِ تجربیہ، تیسرا الرأی الکلی۔ ان معیارات کے مطابق احتیاجات کی تسکین بھی اور اسی طریقے سے وسائل کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور صَرف، معاشی سائنس ہے۔

شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کی جامعیت

آپ دیکھیے کہ معیشت پر کون سا پہلو ہے، جو اس تعریف کے دائرے سے خارج ہوگا؟ اس تعریف میں بنیاد انسان بنا ہے۔ کیوں کہ انسان کی احتیاجات ہیں۔ انسان نے ہی دولت پیدا کرنی ہے۔ انسان نے ہی اس کی تقسیم کرنی ہے۔ انسان ہی کے مفاد کے لیے اُس کی خرید و فروخت ہے۔ انسان ہی کے مفاد کے لیے اس کی احتیاجات کی تسکین کے لیے دولت کی تقسیم کرنے اور صَرف کرنے کا سسٹم ہے۔ اور اسی طریقے سے ہی معیشت کا فلسفہ واضح ہوجاتا ہے کہ انسانیت اصل ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

و لقد کرمنا بنی آدم۔ (ہم نے کل انسانیت کو مکرم اور معزز بنایا ہے)

نیز قرآن نے کہا:

ولقد مکناکم فی الارض.

(ہم نے تمھیں زمین میں تمکین دی ہے) یعنی تمام انسان مراد ہیں۔

وجعلنالکم فیھا معایش

(اور ہم نے تمھارے لیے زندگی بسر کرنے کے معاشی وسائل یہاں پر رکھے ہیں)

تو یہ آیت واضح طور پر بتلاتی ہے کہ معاشیات کا دارومدار انسانی احتیاجات کی تسکین کیلئے اور وہ بھی پورے اجتماع کیلئے ہے۔

عربی کا قاعدہ وضابطہ آپ نے فقہ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ بالخصوص ہدایہ پڑھنے والے تو ضرور جانتے ہیں کہ جب جمع جمع کے مقابلے پر آئے تو مساوات پر دلالت کرتی ہے۔ صاحبِ ہدایہ نے مثال دی ہے کہ کوئی آدمی دس روپے دے کر دس آدمیوں سے کہے کہ یہ تمھارے لیے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے لیے ایک ایک ہے۔ یہ نہیں ہے کہ نو روپے ایک کے ہیں اور ایک روپے میں باقی نو شریک ہیں۔ اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے لیے مساوات ہیں۔ تو قرآنی آیت کی روشنی میں کل انسانیت کے لیے یہ وسائل ہیں۔ لہذا حق معیشت میں مساوات، اسلام کے اقتصادی نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اگر فلسفہ معیشت کی ہم بات کریں تو اس تناظر میں بھی تجزیہ ہمارے سامنے واضح ہونا چاہیے۔ آج بڑا شور وغوغا ہے سرمایہ داری نظام کا اور سوشلزم کا بھی۔ آپ دیکھئے کہ ان کے فلسفۂ حیات کی بنیاد انسان نہیں ہے۔ ان کے فلسفہ حیات کی بنیاد دولت ہے۔ انسان اگر ہے بھی تو ایک مادی شئے کے طور پر محض اس کے جسمانی تقاضے ہیں اور ان جسمانی تقاضوں کی تکمیل کے لیے مادی نقطۂ نظر سے کیسی چیزیں استعمال میں آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری نظام نے سرمایہ یا کیپٹل (Capital) کو اصل قرار دیا ہے۔ سرمایہ کو کیپٹل بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اصل ہے اور انسان اُس کیپٹل کے لیے ہے۔ جب بھی کیپٹل استعمال میں آئے گا تو اس کی واپسی (return) چاہیے ہوگی، انسانیت کو چاہے پھانسی چڑھادو یا انسانیت بھاڑ میں جائے، اس سے سرمایہ کو کوئی غرض نہیں۔ اس لیے سود وغیرہ کی مضرت کی بحث ان کے ہاں کچھ نہیں۔ جہاں سے بھی کیپٹل حاصل ہو، اس کو نگل لو کا اصول ہے۔ گویا کہ اصل سرمایہ ہے، انسان نہیں۔

اور یورپ نے مذہب کو بھی چھوڑا اسی لئے اور یہودیت اور عیسائیت جیسے مذہبوں کو چھوڑ کر اَخلاقِ فاضلہ کے دائرے سے اپنے آپ کو آزاد کر دیا۔ تجرباتی علوم ضرور انھوں نے لیے، لیکن تجرباتی علوم کا استعمال یعنی صنعت و حرفت کا استعمال بھی سرمائے یا دولت کے ارتکاز یا پھیلاؤ کے لیے اور منڈیوں پر قبضہ کرنے کے لیے کیا۔ حال آں کہ اصولاً ٹیکنالوجی کا استعمال تو اس لیے کیا جاتا ہے کہ انسان کے لیے سہولت پیدا ہو، مگر انسان کے بجائے سہولت کس کو پیدا ہوئی؟ سرمائے کو، یا سرمائے کے مالک سرمایہ دار کو۔ گویا اَخلاقِ فاضلہ بھی پیش نظر نہیں کہ اَخلاق کا معاشیات سے ربط ختم ہو گیا اور رائ کلی بھی پس پشت ڈال دیا گیا اجتماعی مفادِ عامہ کو بھی پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ اسی لیے انفرادی سرمایہ دار یا ایک مخصوص طبقہ امیر سے امیر تر بننے کے چکر میں اُن علوم تجربیہ کا ذاتی اور گروہی استعمال کرتا ہے۔

ایک اور حقیقت بھی ہمیں سامنے رکھنی چاہیے کہ سائنس جب بھی کوئی نئی چیز یا ٹیکنالوجی دریافت کرتی ہے تو سائنس کا دریافت کرنا انسانوں کے لیے کسی نہ کسی سہولت کو پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ انسانیت کی مشترکہ

میراث ہوتی ہے اور اجتماعیت کے مفاد کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسی ٹیکنالوجی سے انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے مخصوص سرمایہ دار کو فائدہ پہنچایا جائے تو یہ ٹیکنالوجی کا غلط استعمال ہے، جب کہ ٹیکنالوجی بہ ذاتِ خود بُری نہیں۔ ہمارا مذہبی طبقہ بسا اوقات سرمایہ داری کے خلاف بات کرتا ہے یا جدید مادیت کے خلاف بات کرتا ہے تو سائنس و ٹیکنالوجی کا انکار کر دیتا ہے۔ حال آں کہ ٹیکنالوجی تو انسانی فائدے کے لیے ہوتی ہے مگر اس کے استعمال کے دو طریقے ہیں کہ مخصوص طبقے کے مفاد کے لیے ہو یا پوری سوسائٹی کے لیے۔ گویا اس کے استعمالات پر بحث ہے۔ تو سرمایہ داری نظام سرمائے کو دیوتا بنا کر انسانیت کو اس کے اردگرد گھماتا ہے۔ چناں چہ عاملین پیدائش دولت میں بھی اس کے ہاں سرمایہ اصل ہے۔

عاملین پیدائش کی بحث

عام طور پر عاملین پیدائش دولت چار بیان کیے جاتے ہیں: سرمایہ (Capital)، محنت (Labour)، زمین (Land) اور تنظیم (Organization) بہ ظاہر کہنے کو تو یہ چار قسمیں ہیں، لیکن عملاً اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو کیپٹل سرمایہ دار کا ہے۔ عام طور پر زمین جو اکنامکس کی اصطلاح کے مطابق الگ عامل ہے، مگر اس کو الگ بنانے کا کوئی علمی اور منطقی تصور موجود نہیں، وہ بھی کیپٹل یا اثاثے میں شمار ہوتا ہے جبکہ آرگنائزیشن بھی سرمایہ دار کی ذہنی محنت تصور ہوتی ہے۔ اب رہ جاتی ہے محنت، تو لیبر کے بارے میں ایک قانون، معاشیات میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ لیبر کے پاس بھاؤ تاؤ (bargaining) کی قوت (power) نہیں ہے کیوں کہ ایک دن میں ایک مزدور کو اگر مزدوری نہیں ملی تو اس کا وہ دن ضائع ہو گیا۔ اگر 200 روپے کی مزدوری تھی اور 100 پر اس کو مجبور کیا گیا تو وہ مجبور ہے کہ اگر یہ 100 بھی نہ لیے تو آج کا دن اس کے پاس محفوظ نہیں ہے بیچنے کے لیے۔ جب کہ سرمایہ دار کے پاس سرمایہ برقرار رکھنے کے لیے اگر کسی دن کام نہیں بھی ہوتا تو سرمایہ تو محفوظ ہے۔ اس طرح بارگیننگ پاور نہ ہونے کی وجہ سے محنت کو دوسرے، تیسرے یا چوتھے درجے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ بسا اوقات مفلس مزدور ایسی اُجرت پر راضی ہو جاتا ہے، جس میں اُس کی حقیقی رضا شامل نہیں ہوتی، بلکہ مجبور ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس قسم کا ہر عقد جو کسی بھی مزدور کے ساتھ کیا جائے، یہ دراصل اس معاہدۂ اُجرت کے سراسر خلاف ہے۔ وہ باطل اور سُحت یعنی حرام ہے۔ بہ ظاہر کہا جاتا ہے کہ مزدور خود تو مان گیا تھا کم مزدوری پر کام کرنے کے لیے یا کم تنخواہ پر کام کرنے کے لیے، مگر یہ ماننا تو اضطراری تھا اور جب کسی معاملے میں جبر یا اضطرار کی کیفیت پیدا ہو جائے تو یہ معاہدہ باطل اور حرام ہے۔

تو آپ دیکھیے کہ بارگیننگ کی پاور میں مزدور کا حصہ الگ چاہیے مگر اب جو قدرِ زائد پیدا ہوئی اور میٹریل

کے استعمال سے جو اس کا نفع (profit) آیا، وہ سب کا سب سرمایہ دار اور سرمائے کے مالک کے قبضے میں چلے گئے، مزدور کے پاس کچھ نہیں آیا اور اگر آیا بھی تو بہت معمولی سا حصہ اور اسی حوالے سے دولت کی تقسیم کی بھی نوعیت ہے ، جو ظالمانہ تفاوت پر مبنی ہوتی ہے اور جب تبادلہ دولت کا معاملہ آتا ہے تو وہی پروڈکٹ (product) جو مثلاً تیار ہوئی ہے 10 روپے میں تو تجارت اور تبادلے کے نام پر عام صارف تک پہنچتے ہوئے درمیان میں تاجروں کے، یا ڈسٹری بیوٹر کے ذریعے سے اُس میں اتنا اضافہ ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والے کو فائدہ نہیں ہوتا، مگر درمیان کے مڈل مین (middle man) کو فائدہ ہوتا ہے۔ تو وہاں تبادلہ دولت کا جو حقیقی عمل اور ضابطہ ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ چناں چہ اسلام میں تمام بیوعاتِ فاسدہ، حرام اسی لیے ہیں کہ یا تو وہ باہمی جھگڑا پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں اور یا اُس میں دونوں عاقدین یعنی بائع اور مشتری کے درمیان جو معاملہ طے پا رہا ہے، اس میں کسی ایک فریق کو بالا دستی حاصل ہوتی ہے کہ وہ من مانی قیمت پر چیز بیچتا یا خریدتا ہے۔ آج مثلاً کاشت کار کو بیج، کھاد اور باقی تمام چیزیں غلہ منڈی میں بیٹھا ہوا کمیشن ایجنٹ (commission agent) اپنی قیمت پر بیچتا ہے۔ اور جب اُس کی فصل منڈی میں آتی ہے تو اس کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار کاشت کار کو نہیں ہوتا۔ بلکہ ایجنٹ اسے بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اُس کے ذریعے سے کم سے کم دام پر اس کی ادائیگی کرتا ہے۔ چیز جب خود بیچتا ہے تو اس میں ڈنڈی مارتا ہے اور دوسرے سے خریدتا ہے تو اس سے پورا پورا تو کیا، اس سے زیادہ لینے کی تگ و دو کرتا ہے۔ یہی تو تطفیف ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے:

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علیٰ الناس یستوفون و إذا کالوھم أو وزنوھم یخسرون.

(بربادی ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔ وہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ماپ کر دیتے ہیں یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں۔)

اور پھر جب بے تحاشا دولت کے تعین کی بات سرمایہ دار کے پاس آتی ہے تو وہ بے محابا اسراف یعنی ملکی اور قومی دولت کا بے جا استعمال کرتا ہے۔ جہاں ضرورت نہیں ہے، وہاں بھی خرچ کرتا ہے۔ ظاہر ہے ساری دولت تو کھا نہیں سکتا مگر پیٹ پھر بھی نہیں بھرتا۔ اور وہ آدمی جو محنت کش (laboure) کے طور پر تھا، وہ نانِ جویں کا محتاج اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے بے چارہ قاصر ہے۔ یوں معاشرے میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، جو پہلے لیکچر میں شاہ صاحبؒ کی گفتگو کے تناظر میں بیان کی گئی تھیں کہ دونوں طبقے ہی دین سے دور ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اَخلاقِ فاضلہ کے دائرے سے نکل جاتے ہیں اور سوسائٹی کے مسائل حل کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ الغرض! سرمایہ دارانہ فلسفہ معیشت، سرمائے کو اصل بنا کر انسانوں کو اُس کے گرد گھماتا ہے۔

اب آیئے کمیونزم یا سوشلزم کی طرف۔ بہ ظاہر سرمایہ داری نظام کے مقابلے پر کمیونزم نے اپنے تصورات پیش کیے اور کہا کہ سرمایہ (Capital) عامل پیدائش دولت نہیں، اور اگر ہے تو بھی تو یہ پوری ریاست کے تمام

مزدوروں کی اجتماعی کاوش ہے لہٰذا اس کو ریاست کے قبضے میں ہونا چاہیے اور اشتراکیت ہونی چاہیے۔ مارکس چوں کہ فلسفی ہے اور وہ فلسفے کے استاد ہیگل (1831ء) کا شاگرد ہے۔ جس نے جدلیت کا نظریہ (Dialectic Idealism) دیا۔ ہیگل کے فلسفے کے کچھ حصے مارکس نے لے لیے، واضح رہے کہ یورپ، ان چار فلسفوں سے متاثر ہے، جنھوں نے مذہب کے انکار کی اساس پر یورپ کی نشاتِ ثانیہ میں کردار ادا کیا۔ فیور باخ (1872ء) کا نظریۂ مادیت، روسو (1778ء) کا نظریۂ اجتماع، ڈارون (1882ء) کا نظریۂ ارتقا اور ہیگل کا نظریۂ جدلیت۔ یہ چار فلسفے ہیں۔ (تفصیلات کا یہاں موقع نہیں ہے۔) ان چاروں کے اثرات ہیں، جس کے ملغوبے سے سرمایہ داری نے جنم لیا اور اسی کی اگلی شکل کمیونزم کی صورت میں سامنے آئی۔

ہیگل کا نظریہ جدلیت

ہیگل نے کہا انسان میں جدل ہے۔ انسان میں لڑائی ہے۔ اس نے یہ ایک تصور (concept) دیا۔ تاریخ پر بھی اُسے منطبق (fit) کیا۔ مادیت پر بھی، فزکس، کیمسٹری وغیرہ پر بھی کہ کائنات میں جدل جاری ہے۔ اس نے کہا کہ ایک Thesis ہوتا ہے۔ یعنی آپ نے دعویٰ کیا اور فکر پیش کیا۔ کچھ عرصہ وہ Thesis چلتا ہے۔ پھر اُس کا رَدّ عمل یعنی ایک Antithesis پیدا ہوتا ہے۔ اب اس Thesis اور Antithesis میں جدل ہوتا ہے۔ اور اس جدل کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد امتزاج یعنی Synthesis وجود میں آتا ہے۔ اور پھر یہ Synthesis کچھ عرصے کے بعد خود Thesis بن جاتا ہے۔ پھر اس کا ایک ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس مخالف اور Thesis کے درمیان لڑائی ہوتی ہے۔ تو اُس کا کہنا ہے کہ شروع سے انسانیت میں جو مادی ارتقا کا نظریہ چلا آرہا ہے، وہ Thesis اور Antithesis کا کھیل ہے۔ اور جب بھی Thesis اور Antithesis میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو Synthesis اس کی اشتراکی حالت ہوتی ہے یعنی اس جدل کے نتیجے میں ایک مشترک چیز وجود میں آتی ہے۔

اب ہیگل کے فلسفے پر جب یہ سوالات ہوئے کہ آخر اس کائنات میں یہ جدل کیوں جاری ہے؟ فکر میں بھی، تاریخ میں بھی، سیاست میں بھی، معیشت میں بھی، افکار و خیالات میں بھی اور باقی تمام مادی چیزوں میں بھی۔ تو ہیگل نے جواب دیا تھا کہ اس کائنات کی ایک روح الکل ہے اور وہ بے چین ہے۔ اُس کو اپنے ارتقا کے لیے اس جدل کی ضرورت ہے یعنی یہ ایک روح کے تابع کام ہو رہا ہے۔ اور ایک مرحلے پر جب کائنات مکمل ہو جائے گی، تو یہ جدل بھی ختم ہو جائے گا۔ یعنی اُس کے نزدیک تو یہ جدل اُس ایٹمی ری ایکٹر کے گنبد کے اندر تھا، جس کو اُس نے روح کہا، گویا کسی درجے میں روحانیت کی بات کی۔

مارکس نے آکر کہا کہ ہیگل نے یہ جو روح الکل کی بات کی ہے، یہ عینیت کی بات ہے۔ یہ تو تخیلاتی بات ہے جب کہ روح وغیرہ کچھ نہیں ہوتی۔ محض مادی جنم ہوتا ہے۔ یعنی اس نے اپنے استاد کی پوری بات نہیں مانی۔ بلکہ

اس کی بجائے فیور باخ کے نظریۂ مادیت کو لیا، ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو لیا، روسو کے نظریۂ اجتماع کو لیا اور ہیگل کے نظریۂ جدلیت کو لے کر فلسفہ اشتراکیت تشکیل دیا۔ گویا کہ معاشی سیاسی افکار و خیالات کو جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی بنیاد پر آگے بڑھایا۔

اس اساس پر اُس نے کہا کہ جب صنعتی دور آیا اور سرمایہ داری نظام ایڈم سمتھ کے نظریات کے تحت بنا، تو یہ Thesis تھا کہ سرمایہ دار کے پاس دولت جمع ہونا شروع ہوگئی۔ اس کے مقابلے پر مزدوروں کی طاقتیں اُبھریں۔ یہاں واضح رہے کہ 1835ء میں پہلا کمیون امریکا میں بنا اور اس کے لیے کمیون کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جرمنی کے کچھ گاؤں اور دیہاتوں میں اسی طرح ردِّ عمل پیدا ہوا۔ مارکس نے (Communism) کا لفظ بعد میں استعمال کیا یعنی اجتماعی نظام۔ اُس نے کہا کہ اب یہ مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان جو جدل ہوگا تو اس جدل کے نتیجے میں Synthesis یعنی اشترکیت وجود میں آئے گی۔

شاہ صاحب کی نظر میں وحدت انسانیت

اب آیئے! شاہ صاحبؒ کے فلسفہ معاشیات پر غور کیجئے کہ انہوں نے جب یہ بات کہی کہ الرأی الکلی، یعنی کل انسانیت کے تناظر میں بات ہونی چاہیے، معاشیات کی تاریخ میں بھی، دولت کی پیدائش میں بھی، تقسیم میں بھی، تبادلے اور صَرف میں بھی۔ قرآن وسنت سے یہ بات واضح کی کہ ولقد کرمنا بنی آدم. یعنی کل انسانیت مکرم اور معظم ہے۔ اور شاہ صاحبؒ کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانیت اپنی نوع کے اعتبار سے ایک ہے۔ وحدتِ انسانیت کا تصور (concept) دیا کہ اپنے نوعی تقاضوں اور جسمانی تقاضوں کے اعتبار سے تمام لوگ برابر ہیں۔ مثلاً بھوک ہر ایک کو لگتی ہے۔ پیاس ہر ایک کو لگتی ہے۔ سردی گرمی سے بچاؤ ہر ایک کی ضرورت ہے، چاہے وہ کوئی انجینئر ہو، ڈاکٹر ہو، مزدور ہو، کسان ہو، پڑھا لکھا ہو، جاہل ہو۔ یعنی معاشی احتیاجات کی تسکین کی ضرورت ہر انسان کو ہے۔ تو یہ تمام انسان ایک وحدت میں پروئے ہوئے ہیں نوعی تقاضے کے اعتبار سے۔ تو انھوں نے اس کے لیے انسانیت کو اصل قرار دیا۔

انسانوں کی اس وحدت سے اوپر کائنات بھی ایک وحدت لیے ہوئے ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے فلسفے میں کائنات میں وحدت پر بہت زور دیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ یہ کائنات مختلف اور متنوع ہونے کے باوجود ایک شخص ہے، جیسے یہ انسان شخص اصغر یا شخص صغیر ہے، ایسے ہی یہ پوری کائنات ایک شخص اکبر ہے۔ اور جیسے اس جسم انسانی میں ایک روح، روح جزئی اور ایک طبیعت الجزء، یعنی جسم ہے۔ ایسے ہی اس پورے شخص اکبر کی بھی ایک روح الکل اور ایک اس کا جسم الکل یا طبیعت الکل ہے۔ تو وحدتِ کائنات یعنی اس میں ایک درجے کی وحدت، تمام تر تنوعات کے باوجود ہے۔ کم از کم وجود میں تو وحدت ہے کہ تمام اشیاء عرش سے لے کر فرش تک اپنا ایک وجود رکھتی

ہے۔ زمان ومکان میں آٹھ دس چیزیں جو فلاسفہ نے متعین کی ہیں، اُس کے تناظر میں وہ ایک وحدت رکھتی ہیں۔ اُس وحدت کے اندر ایک وحدت نوعِ انسانی کی بھی ہے۔ اور ہمارا مطمحِ نظر انسانوں کے لیے نظام بنانا ہے۔ کائنات کی وحدت کا نظام تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے پاس ہے اور اس کا تکوینی نظام ہے۔ اُس کے لیے تو تقدیرات وضع کر دی گئیں۔

پیدائش دولت میں شرکت کی اہمیت

یہ شریعت نوعِ انسانیت کی ترقی کے لیے اللہ نے مقرر کی ہے اور اس کا ایک اہم ترین شعبہ معیشت ہے۔ تعریف اور فلسفے کے بعد اس کے بنیادی امور بھی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس حقیقت کی نشان دہی بھی کی ہے کہ ہر انسان کو جو سوسائٹی میں موجود ہے، اُسے پیدائش دولت کے عمل میں شرکت کرنی ہے۔ لوگ معاشرے پر بوجھ نہیں ہونے چاہئیں۔ مفت خورے نہیں ہونے چاہئیں۔ تمام لوگ کام کریں گے۔ ورنہ تو اگر کام کے بغیر وہ چیز لینا چاہتے ہیں تو شاہ صاحب کے الفاظ میں یصیرون کلاً علیٰ المدینہ ۔ (وہ سوسائٹی پر بوجھ بن جاتے ہیں۔) لہذا پیدائش دولت کے عمل میں ہر انسان کو شریک ہونا ضروری ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

من فقه الرجل ان ینظر الیٰ حاجاته فلیختر کسباً یکفی لها.

(انسان کی دانش اور شعور کا تقاضہ ہے کہ اپنی حاجات کا تعین کرے اور ان کے لئے کفایت کرنے والے پیشہ کا انتخاب کرے) مثلاً اس کا گھر چلانے کے لیے، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے، کس طرح کے وسائل کی ضرورت ہے۔ اور اُن وسائل کے مطابق اُسے کیا پیشہ اختیار کرنا ہے۔ شاہ صاحب نے پیشوں کے لیے بنیادی جو دائرے متعین کیے ہیں وہ اصول المکاسب، یعنی تمام پیشوں کے بنیادی اساسی اصول تین ہی ہیں: زراعت، صنعت اور تجارت۔ اور اس سے پھوٹنے والے اس کے ذیلی شعبے ہیں۔ اور پھر ان تینوں شعبوں کو منظم کرنے والا دہ ریاستی نظام، یا انتظامیہ جو داخلی سلامتی کے ادارے اور باہر کے حملہ آوروں سے بچانے کے لیے عسکری یا فوجی قوت کی صورت میں یا انتظامی نظم ونسق چلانے والوں کی صورت میں ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس تناظر میں سوسائٹی میں دولت کی پیدائش کا عمل ہموار طریقے سے آگے بڑھنا چاہیے۔

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ تمام انسان مدنی الطبع ہیں۔ اجتماعیت کی سوچ رکھتے ہیں۔ اس لیے لازماً تمام لوگوں میں، اللہ نے **ایجاب التعاون** کا فیصلہ جاری کر دیا ہے، یعنی تعاونِ باہمی واجب لازمی اور ضروری ہے۔ تعاونِ باہمی ہے تو درست، اور اگر تعاونِ باہمی نہیں ہے، اختلاف وانتشار ہے، ہر آدمی دوسرے کو کہنی مار کر پیچھے گرانا چاہتا ہے اور خود آگے بڑھنا چاہتا ہے تو یہ بنیادی طور پر دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور صَرف کے تمام اصولوں کے تناظر میں غلط ہے۔

پیدائش دولت کے عمل میں بھی تمام لوگ شریک ہوں گے، سوائے مجنون و پاگل کے۔ اور اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی واضح کیا۔ آپ ﷺ مسجدِ نبوی میں بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان کندھے پر رسّی اور کلہاڑی رکھے جنگل میں لکڑیاں کاٹنے، محنت مزدوری کرنے جا رہا ہے۔ تو کچھ صحابی بیٹھے آپس میں بات کرتے ہیں کہ یہ کتنا محروم شخص ہے کہ امام الانبیا کا وعظ ہو رہا ہے اور یہ دنیا کی طرف بھاگا دوڑا جا رہا ہے۔ حضور ﷺ نے اُن سے کہا کہ کیا بات کی تم نے؟ آپ ﷺ خود تو سن چکے تھے، لیکن مجمع کو سنانے کے لیے کہا کہ کھڑے ہو کر بتاؤ۔ انھوں نے اپنی بات دہرائی۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو! اگر یہ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں اور گھر والوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جا رہا ہے تو یہ ایسے ہی فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) ہے، جیسے تم فی سبیل اللہ ہو۔ اور اگر یہ کسی دُنیاوی مفاد اور محض دولت کی ہوس اکٹھا کرنے کی نیت سے جا رہا ہے تو پھر تم فی سبیل اللہ اور وہ فی سبیل الشیطان ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر کچھ لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے اور وہاں آ کر انھوں نے کہا کہ فلاں صاحب بڑے نیک ہیں، آپ ﷺ نے پوچھا کیسے نیک ہیں؟ انھوں نے کہا بڑی عبادت کرتے ہیں، سارا دن نفلیں پڑھتے ہیں۔ ساری رات عبادت کرتے ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ کھاتے کیسے ہیں؟ کہ کھائے پیے بغیر تو انسان زندہ نہیں رہتا۔ تو انھوں نے کہا کہ ہم کماتے ہیں اور کچھ ان کو کھانے کے لیے دے دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نیک تو تم ہو جو اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہو۔

پھر شاہ صاحبؒ نے کہا کہ پیدائش دولت کے عمل میں جب بھی کوئی عمل شروع کیا جائے تو ہر پیشے میں کام کرنے والے کو اپنے اندر یہ مہارت اور صلاحیت پیدا کرنی ہے کہ سب سے پہلے اُس پیشے کے جو بنیادی ارکان ہیں یا بنیادی ڈھانچہ ہے، اُسے پورا کرے جبکہ اس کی تزئین و آرائش پر پیسہ بعد میں خرچ کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے پیشے کی بنیاد پر پیدائش کا عمل، سوسائٹی کی ترقی کے لیے ہونا چاہیے، محض ذاتی مفاد سے نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"التّاجر الصّدوق الأمین مع النّبیّین و الصّدّیقین و الشهداء."

(سچا امانت دار تاجر، قیامت کے روز انبیاؑ اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔)

کیونکہ تجارت کا مقصد پیسہ بٹورنا نہیں ہے۔ تجارت کا مقصد انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے انسانوں کے کام آنا ہے۔

پیدائش دولت کیا ہوتی ہے؟ یہ درحقیقت چیز میں افادیت پیدا کرنا ہے۔ یہ افادیت کئی طرح سے بیان کی جاتی ہے: (۱) افادۂ شکل (Utility of Form) آپ نے پیدا شدہ قدرتی مادے کے اندر ایک نئی شکل پیدا کر دی۔ مثلاً درخت لکڑی جنگل سے کاٹ کر لا کر فرنیچر بنا دیا تو نئی شکل و صورت دے دی۔ ایک ضرورت کو پورا کرنے کا ایک آپ نے عمل کیا۔ یہ تخلیق کا عمل ہے، پیدائش کا عمل ہے۔ (۲) دوسرا افادۂ مقام ہے۔ (Utility of

(Place) ایک جگہ سے اٹھا کر آپ اس کو دوسری جگہ پر لے گئے اور اس تک انسانوں کی رسائی مفید بنادی۔ (۳) تیسرا افادہ وقت ہے (Utility of Time) کہ انسانوں کو جس وقت اشیاء کی ضرورت ہے اس موقع پر ان کی رسائی کو ان کے لئے مفید بنانا (۴) چوتھا عمل اس کے تحفظ کا ہے (Utility of Possession) ایک وقت تک آپ نے اس چیز کو محفوظ رکھا اپنی اور دیگر انسانوں کی ضروریات کی تکمیل کی نیت سے۔ یوں سماجی افادیت پیدا ہوئی۔ حقیقی افادیت پیدا کرنے کی صورت میں ہی اس کا ایک معقول منافع یا اس کا ایک معقول معاوضہ آپ لینے کے حق دار ہوتے ہیں۔ اس کا پورا طریقۂ کار شاہ صاحبؒ نے وضع کیا۔

تبادلہ دولت کا اصول

اسی طریقے سے خرید و فروخت پر مبنی جتنی بھی احادیث ہیں، ان ایک خلاصہ بیان کیا۔ اور بتلایا کہ یہ تبادلہ دولت کا عمل اعلیٰ انسانی اصولوں پر، تعاونِ باہمی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہر وہ بیع باطل اور فاسد ہے، جو کسی بھی ایک فریق کو نقصان پہنچائے۔ ہم بیوعات میں پڑھتے ہیں کہ چار چیزیں ہوتی ہیں: بائع، مشتری، ثمن اور مبیع۔ بائع اور مشتری کی عقد کے اندر حیثیت برابر ہوتی ہے۔ اگر برابر نہیں ہے، کسی ایک کا مفاد زیادہ ہے یا کوئی بھی شرط اس قسم کی لگا دی جائے تو بیع باطل اور فاسد ہو جاتی ہے۔ اسی طریقے سے ثمن (قیمت) اور مبیع (فروخت شدہ چیز) بھی دونوں ہم مثل یا مماثلت ہونی چاہیے۔ اگر اُونچ نیچ ہوگی اور کمی زیادتی ہوگی تو وہ بھی بیع فاسد ہوگی۔ گویا عقد باطل ہو جاتا ہے دونوں متبادل اشیا کے کم یا زیادہ ہونے سے، یا بائع اور مشتری میں سے کسی ایک کے ظلم کے نتیجے میں۔

تقسیم دولت کی حکمت عملی

انسانی اجتماعی مفاد کا یہی وہ قانون اور ضابطہ ہے، جسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ نے واضح کیا کہ جب اپنے عہد خلافت میں بیت المال کی تقسیم کے وقت تمام لوگوں کو برابر اور مساوی طور پر استفادے کے لیے پیسے دیے۔ کتاب الخراج میں قاضی ابویوسفؒ نے ان کے اعداد و شمار بتلائے ہیں کہ ایک بار 7.1/3 درہم اور دوسری بار 20 درہم سب کو ملے۔ تو لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ سب کو برابر دے دیا؟ مساوات کر دی؟ حالاں کہ صحابہؓ میں سے ایسے صحابی ہیں، جنھوں نے بدر میں خدمات سرانجام دیں۔ بدر سے لے کر اب تک اُن کی محنتیں ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں، جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ کچھ لوگ ہیں، جو ابھی مسلمان ہوئے۔ آپ نے سب کو برابر کر دیا۔ قاضی ابویوسف نے ان کا یہ جملہ نقل کیا ہے:

"هذا معاش فالاسوة فيه خير من الاثُرة."

(یہ معاشیات کا معاملہ ہے۔ اس میں مساوات بہتر ہے، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے)

"اما ذكرتم من السوابق و القدم و الفضل."

(وہ جو تم نے ذکر کیا ہے کہ سابقون الاوّلون نے بڑے فضیلت کے کام کیے ہیں) مثلاً بدر میں بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔

"فإنما ثوابهٗ علیٰ اللّٰه."

(تو اس کا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے) یعنی اس دنیا میں اس بنیاد پر کوئی معاوضہ نہیں ہے کہ غزوۂ بدر میں زیادہ خدمات سرانجام دیں۔ گویا مطالبہ کرنے والوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ مال داروں کو مزید ملنا چاہیے اور غریبوں کو کم ملنا چاہیے۔ بلکہ اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ جنھوں نے غلبہ دین کے لیے خدمات زیادہ انجام دی ہیں، اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کو کچھ زیادہ ملنا چاہیے۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ نہیں: ''ھذا معاش فالاسوة فیه خیر من الاُثرة۔'' تو معاشی مساوات کا قانون واضح کیا۔

صرفِ دولت کا اصول

معاشروں میں صرفِ دولت کے دو طریقے پائے جاتے ہیں اسراف یا تبذیر، اور اس کے مقابلے میں تقتیر یا بخل، ان دونوں سے ہٹ کر کان بین ذٰلک قواما۔ کا درمیانہ درجہ قرآن حکیم نے متعین کیا ہے۔ مثلاً ضرورت دس روپے خرچ کرنے کی ہے، وہاں پر بیس خرچ کر دیے جائیں، اسراف ہے۔ ضرورت دس روپے خرچ کرنے کی ہے اور وہاں پانچ روپے خرچ کر دیے جائیں، یہ بخل یا تقتیر ہے۔

فاسد معاشی نظام

پھر شاہ صاحبؒ نے یہ بات واضح کی کہ یہ بھی ضروری امر ہے کہ معاشی سسٹم کا تعلق ریاست کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس پر بڑی خوب صورت بات کہی شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانے کے تناظر میں کہ:

"و غالب سبب خراب البُلدان فی هذا الزّمان شیئان:

أحدهما تضییقهم علیٰ بیت المال، بأن یعتادوا التّکسّب بالأخذ منهم علیٰ أنّهم من الغُزاة، أو من العلماء الّذین لهم حقّ فیه، أو من الّذین جرت عادت الملوک بصلتهم، کالزّهّاد والشّعراء، أو بوجه من وجوه التّکدّی، و یکون العمدة عندهم هو التّکسّب، دون القیام بالمصلحة، فیدخل قوم علیٰ قوم فینغصون علیهم و یصیرون کلًّا علیٰ المدینة.

والثانی ضرب الضرائب الثقیلة علی الزارع والتاجر والمتحرفة والتشدید علیهم حتی یفضی الی اجحاف المطاوعین واستئصا لهم والی تمنع اولی باس شدید وبغیهم"

(اس زمانہ میں ملکوں کی خرابی کے دو بنیادی اسباب ہیں:
ایک بڑا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے قومی خزانے کو مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعے لوٹنا شروع کر دیا ہے، اور

اس ذاتی مفاد پرستی پر مبنی لوٹ کھسوٹ کو ہی اپنی کمائی کا دھندہ بنالیا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو غازی اور مجاہد بن کر اسے لوٹ رہے ہیں۔ بعض علما ہیں جو اپنے تئیں علم کی وجہ سے قومی خزانے کا مستحق سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو حکمران طبقات سے بخشش اور انعام و اکرام کے طلب گار رہتے ہیں، جیسے نام نہاد صوفی، شاعر اور ادیب لوگ ہیں۔ اور باقی لوگ بھی لوٹ کھسوٹ کے مختلف حیلوں بہانوں سے قومی خزانے کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ ان میں ذاتی مفادات اتنے غالب آچکے ہیں کہ انھوں نے اسی لوٹ کھسوٹ کو اپنی کمائی کا پیشہ بنایا ہوا ہے۔ اور وہ اسے قومی اور اجتماعی مصلحتوں سے قطع نظر بہت اچھا کام سمجھتے ہیں۔ ذاتی مفاد پرستی کا عالم یہ ہوگیا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور پھر وہ ایک دوسرے کے لیے تنگی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ تمام لوگ سوسائٹی اور ملک پر بوجھ بن چکے ہیں۔

اور دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ کاشتکاروں، تاجروں اور ہنرمندوں (professionals) یعنی پیداواری جماعتوں پر بھاری ٹیکسز عائد کردیئے جاتے ہیں اور ان کی وصولی کے لئے ان پر تشدد کیا جاتا ہے، یہاں تک صورت حال یہ بن جاتی ہے کہ قانون کی پاس داری کرنے والوں کے حقوق بغیر کسی شنوائی کے سلب کر لئے جاتے ہیں اور ان کو تباہ و برباد کردیا جاتا ہے اور طاقتور گروہ محاذ آرائی اور سرکشی پر اتر آتے ہیں)

شاہ صاحب نے واضح کیا کہ بیت المال پر تمام لوگوں کا جھپٹنا، اس کے وسائل کو لوٹنا اور اس لوٹ کھسوٹ میں تمام تر افراد کا شامل ہونا معاشی عدمِ استحکام کا سبب بن گیا۔ شاہ صاحبؒ نے لکھا کہ جو فوجی اور اُمرا ہیں، وہ اس لیے کہ ہم نے ملک کی خدمت سرانجام دی ہے، ہمیں زیادہ سے زیادہ پیسے ملنے چاہئیں۔ علما ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم علم دے رہے ہیں، اس لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ بیت المال سے پیسے ملنے چاہئیں۔ شعرا اور اُدبا ہیں، وہ اس بیت المال پر جھپٹنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظریں اس پر ہیں۔ وعظ گو ہیں تو وہ اپنے وعظ کا وظیفہ بھی خلیفہ اور حکومت سے لینا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اور تو اَور وہ فقرا اور زہاد یا صوفیا جو زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کرنے کے دعویدار ہیں، وہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کا معاوضہ ہمیں حکومت سے ملے۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ عجیب بات ہے کہ بیت المال ہے، جو قومی نظام چلانے کے لیے، ملکی نظم و نسق کی عمومی اسلامی مصلحت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے یا یہ کہ یہ اُجاڑنے کی جگہ ہے کہ ہر آدمی اُس پر بوجھ بن جائے

شاہ صاحبؒ نے آخر میں یہ اہم جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ: ''یہ سب کے سب اس سوسائٹی پر بوجھ بن چکے ہیں۔'' اور پھر اس چھینا جھپٹی میں ہر ہر طبقے کا جہاں داؤ لگتا ہے تو وہ اس داؤ کے نتیجے میں آپس میں لڑ پڑتے ہیں، ایک دوسرے پر فتوے لگاتے ہیں، کافر بناتے ہیں، مال و دولت کی لڑائی جھگڑے کے سبب ایک دوسرے کی عزتیں اُچھالتے ہیں، یہاں تک کہ سارے ہی لوگ حکومت کے سامنے دریوزہ گر اور بھیک مانگنے والے بن گئے۔ ایک جملہ حضرتؒ نے فرمایا ہے کہ: ان کے نزدیک عمدہ ترین بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے حکومت سے مال لوٹا جائے۔ ملک کی اصلاح اور سوسائٹی کی ترقی کا نظام قائم کرنا ان کا مقصد اور ہدف نہیں ہے۔ یہی تکسّب ہے، یہی ان کا پیشہ ہے۔

اس طرح طبقاتی نظام وجود میں آ جاتا ہے۔ جن کا ہاتھ پڑتا ہے اور طاقت ور ہیں وہ تو حکومت کے خزانے یا قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر سب سے آگے ہیں اور اس طرح امیر سے امیر تر بنتے جا رہے ہیں۔ جس بے چارے کا ہاتھ نہیں پڑتا، وہ غریب اور غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا۔

شاہ صاحبؒ قیصر و کسریٰ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''و ما تراہ من ملوک بلادک یغنیک عن حکایاتھم، فدخل کلّ ذٰلک فی أصول معاشھم، و صار لا یخرج من قلوبھم إلّا أن تمزّع و تولّد من ذالک داء عضال، دخل فی جمیع أعضاء المدینة.''

یعنی عصر حاضر کے ملوک و سلاطین اور والیانِ ریاست کی عیاشیوں کو دیکھ کر تم ان (قیصر و کسریٰ) کی عیاشیوں اور زندگی کی لذات میں حد سے بڑھنے کا اندازہ لگا سکتے ہو، سرمایہ پرستی کے یہ تمام امراض ان کے اصولِ معاشیات میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کا یہ طریقہ ان کے رَگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ جس کی وَجہ سے پورے تمدن اور معاشرے میں موجود تمام جماعتوں (communities) میں ایک لا علاج رَوگ پیدا ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ کسی قوم میں اگر سبھی لوگ وسائل کو لوٹنے لگ جائیں تو اتنے وسائل کہاں سے آئیں گے؟ اس کے نتیجے میں ایک دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ جو کاشت کار، صنعت کار، یا تاجر ہیں، تو ان کام کرنے والوں پر ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ جب یہ ظالمانہ ٹیکس ادا نہیں کر سکتے تو وہ مجبور ہو کر دو راستے اپناتے ہیں: یا تو وہ ردِّ عمل میں تشدد پسند بنتے ہیں۔ پھر حکمران طبقہ اُن کے قتل کے درپے ہوتا ہے۔ یا مجبوراً وہ ٹیکس دیتے ہیں تو اُن کی کارکردگی پر فرق پڑتا ہے اور وہ غریب سے غریب تر بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح قومی ریونیو (revenue) مسلسل گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی کتابوں میں کئی مقامات پر اس کا واضح نقشہ کھینچا ہے۔ ایک جگہ شاہ صاحبؒ بتاتے ہیں:

''عیاشانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ساز و سامان کا حصول ایک خطیر دولت خرچ کیے بغیر ناممکن ہوتا ہے جس کے لئے محنت کش طبقات یعنی کسانوں اور تاجروں وغیرہ پر بھاری ٹیکس لگا کر ان کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ ٹیکس دینے سے انکار کر دیں تو ان کو مارا پیٹا جاتا اور سخت سزائیں دی جاتی ہیں اور اگر سرمایہ داروں کی اطاعت بجالائیں تو ایسے بیلوں اور گدھوں کی سی ذلیل زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن سے ان کی مرضی کے بغیر ہل چلانے، زمین کی کاشت، پیداوار اٹھانے اور کنویں سے پانی نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ جن کی تھوڑی بہت پرورش یا غور و پرداخت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ مالکوں کی اپنے اغراض ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں''

شاہ صاحبؒ اس معاشی بدحالی کا ایک بنیادی حل تجویز کرتے ہیں

وانما تصلح المدينة بالجباية اليسيرة واقامة الحفظة بقدر الضرورة ،فليتنبه اهل الزمان لهذه النكتة ،

یعنی پہلی بات تو یہ کی کہ سوسائٹی کی ترقی اس میں ہے کہ کم سے کم ٹیکس اور ادائیگی میں آسان ٹیکس عائد ہوں اور سوسائٹی کی سب سے زیادہ ترقی جو اصلاً پیداوار کرنے والے لوگ ہیں، اُن کی حقیقی تجارت زراعت اور صنعت سے ہوگی۔ اور شاہ صاحبؒ نے دوسری بات یہ کہی کہ حکمرانی کے نظام میں جو حکمرانی کا سسٹم بنانے والے لوگ ہیں، وہ بہ قدرِ ضرورت ہوں، یعنی جتنی سوسائٹی کو ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو کہ وزیروں و مشیروں کی فوج ظفر موج ہو۔ فوج بلاوجہ کی بھرتی ہو اور داخلی سیکیورٹی فورسز اپنے رشتے داروں اور خاندانوں سے بھرتی کر لیے جائیں۔ الغرض جس ریاست کا معاشی نظام خراب ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ بیت المال یا قومی دولت پر مفت خورے مسلط ہو جاتے ہیں اور ٹیکسوں کا ظالمانہ نظام ہوتا ہے۔

نظامِ فاسد کا علاج

معاشی بدحالی کے علاج کے طور پر شاہ صاحبؒ نے آخری بات جو بیان فرمائی کہ جب کسی سوسائٹی پر ایسا مرض مسلط ہو جائے تو وہ نظام توڑے بغیر مسئلہ حل نہیں ہوتا، یعنی فک کل نظام۔ اور اُس پر حضور ﷺ کی سنت کا تذکرہ کیا کہ قیصر و کسریٰ کے زمانے میں بھی یہی حالت تھی تو نبی اکرم ﷺ کے قلب میں یہ بات ڈالی گئی کہ اس طرح کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ایسے سسٹم کا مادہ ہی سِرے سے ختم کر دیا جائے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

"فقطع دابر القوم الذين ظلموا."

(ظلم پیشہ لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔)

شاہ صاحبؒ نے واضح طور پر اس کی تعیین کی گویا کہ معاشی سسٹم میں رائی جزئی، یعنی انفرادی مفادات پر یا بہ الفاظِ دیگر سرمایہ داری نظام، بنائے ہوئے نظام کی اساس پر جو عمل بھی کیا جائے گا، وہ سوسائٹی کے لیے عذاب کا باعث ہے اور اُس عذاب کو دور کرنے کے لیے مسلمان جماعت پر لازمی ہے کہ اُس پورے سسٹم کو توڑے۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں:

"فالحكم فك الربط."

کئی جگہ پر یہ لفظ استعمال کیے۔ کیوں کہ گھر کے نظام میں، شہر کے نظام میں، بین الاقوامی ڈھانچے میں، ہر ایک سطح میں ریاست کے قائم کرنے کی وجہ سوسائٹی کی ضروریات پوری کرنا ہے۔ اور اگر کوئی بھی معاہدہ ضرورت پوری نہ کر رہا ہو تو حکم یہ ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے۔ چناں چہ میاں بیوی کی مثال دے کر کہا ہے کہ اگر دونوں جس سماجی

ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک چھت تلے جمع ہوئے ہیں، وہ پوری نہیں ہوتی اور ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا انتہا تک پہنچ چکا ہے کہ اب اس کا کوئی حل نہیں تو حکم یہ ہے کہ اس تعلق کو توڑ دیا جائے۔ حتیٰ کہ مرد طلاق نہ دے رہا ہو تو قاضی کو بھی یہ اختیار منتقل ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقی صورتِ حال کی بنیاد پر رشتہ توڑ دے۔ تاکہ مرد و عورت کہیں اور معاہدہ کر لیں۔ اسی طرح ریاست میں بھی اگر معاشی سسٹم پر قابض حکمران طبقے ایسے ہوں تو اُن کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے اس گزشتہ عرصہ میں اسلام کی ان اعلیٰ تعلیمات کا معاشی نظام نہ تو علمی طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور نہ ہی اس کی اساس پر پڑھنے پڑھانے کا کوئی نظام فکر اور تصور سامنے ہے۔ آج ہماری یونیورسٹیاں اور کالجز سرمایہ دارانہ اکنامکس پڑھاتی ہیں، زیادہ سے زیادہ زور لڑائیں گے تو ایڈم سمتھ اور مارکس وغیرہ کے تصورات پڑھادیں گے۔ اسلامی معیشت کے نام پر محض زکوٰۃ، صدقات، خیرات، اوقاف کا ذکر کیا جاتا ہے، ان تصورات کا اسلام کے علمی نظام سے کوئی تعلق نہیں کہ اُسے اسلامی معیشت کے نام پر پڑھایا جائے کہ اس میں نہ معاشیات کی تعریف، نہ کوئی تقابلی جائزہ، نہ پیدائش دولت، نہ صرفِ دولت کی علمی بحث، نہ عاملین پیدائش دولت پر کوئی گفتگو، نہ اس کے حوالے سے کوئی متفقہ تصورات ہماری سوسائٹی میں پڑھائے جاتے ہیں۔

سرمایہ داری نظام، سو سال غلامی کے زمانے میں ہماری سوسائٹی میں رہا۔ آج اعلانِ آزادی کے بعد ستر سال سے بھی وہی ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں نجکاری کا قانون، انفرادیت کی بنیاد پر اور کھلی منڈی کی معیشت کی بنیاد پر ہے، اسی طرح عالمی سطح پر دوسرے ملکوں کی منڈیوں پر قبضے کا سامراجی طور طریقہ ہے، یہ ظلم کا نظام ہے، جس سے آج پوری ہماری سوسائٹی عذاب میں مبتلا ہے۔ قرضوں کی معیشت کے سبب مسلسل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر بچہ پیدا ہوتے ہی مقروض ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ہم نے دین اسلام اور بالخصوص جس جامعیت کے ساتھ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کا فکر و عمل پیش کیا تھا، اس کو نہ اہل علم نے اس طریقے سے پھیلایا اور نہ ہی اس کی اساس پر اپنی معیشت قائم کرنے کے لیے ہم نے کوئی حکمتِ عملی بنائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں دین اسلام کی ان معاشی تعلیمات کو درست تناظر میں سمجھنے اور اس کے مطابق حکمتِ عملی بنانے اور جدوجہد و کوشش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين!

سوالات و جوابات

سوال

دنیا میں معاشی حوالے سے 1930ء، 1970ء، یا 2008ء کے بعد آنے والے بحرانوں (crisis) کا ذکر ہوتا ہے۔ ان کی اہم وجوہ ذکر کرتے اور ان کے حل کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ کیا شاہ صاحبؒ کے نظریات اور اُن کی تعلیمات میں اس قسم کے کرائسز کا کوئی ذکر ہے؟ اور کیا شاہ صاحبؒ نے ان کا کوئی حل پیش کیا ہے؟

جواب

یہ بحران (crisis) سرمایہ داری نظام کے ہیں۔ 1930ء کا بحران ہو، جس کو سرمایہ داری میں تجارتی چکر کہا جاتا ہے کہ پیداوار زیادہ ہوگئی، طلب اس کی موجود نہیں تھی۔ مصنوعی طلب اور رسد کی اساس پر قوتِ خرید لوگوں سے ختم ہوگئی۔ تو بحران کی کیفیت پیدا ہوئی۔ یا اسی طریقے سے اس کے بعد 1970ء کی دہائی میں جو بحران پیدا ہوا، وہ بھی سرمایہ داری کا ہے۔ 2008ء میں بھی جو بحران پیدا ہوا، وہ بھی سرمایہ داری کا ہے۔ مورگیج سسٹم (Mortgage System) کے تحت یہ بحران پیدا ہوا کہ جب ایک پلاٹ مثلاً ایک کروڑ کا تھا، آپ نے اس پر دس جگہ قرض دے دیا، مثلاً دس کروڑ دے دیا۔ اور ہر آدمی جب پیسہ مانگنے کیلئے آئے تو ظاہر ہے کہ پیسہ تو نہیں ہوگا، یہی سوال ہے کہ کیا ایک اثاثہ نوگنا زیادہ پر قرض دیا جاسکتا ہے؟ تو یہ سرمایہ داری نظام کا چکر ہے۔

ولی اللّٰہی فکر کی اساس پر ان کا تجزیہ یہی ہے کہ یہ جو تجارتی چکر یا مصنوعی عمل ہے کہ جب آپ نے انسانیت کو ایک طرف رکھ دیا اور صرف سرمائے کی واپسی کی بنیاد پر خود ساختہ تصورات کے تحت اس کا سلسلہ شروع کر دیا اور زر کی جو حقیقی نوعیت تھی، وہ ختم کر کے کرنسی نوٹ اور اب ڈیجیٹل نوٹ بھی آنے شروع ہوگئے، گویا مصنوعی عمل شروع کر دیا تو اس کے نتیجے میں تو یہ بحران پیدا ہونے ہیں تو جب تک حقیقی معیشت نہیں ہوگی، تو اسی طرح کے تضادات اور بحرانات آتے رہیں گے۔

سوال

ہیگل کے نظریہ روح الکل اور شاہ صاحب کے نظریۂ روح الکل میں بنیادی طور پر کیا فرق ہے؟ لگتا تو ایسے ہے کہ وہ بھی مذہب کی طرف سے ہے اور یہ بھی مذہب کی بنیاد پر ہے۔؟

جواب

شاہ صاحبؒ کے نزدیک روح الکل کے ساتھ طبیعت الکل بھی ہے اور شخص اکبر کا مکمل تصور ہے، جب

کہ ہیگل کی طرف سے تو صرف روح الکل کی بات آئی ہے۔

سوال

آج کے معاشی نظام میں بینکنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں اسلامی معاشیات کے حوالے سے کچھ لوگ کام کر رہے ہیں، تو اس کے حوالے سے یہاں پر کچھ ماڈل موجود ہیں۔ اس کو شاہ صاحبؒ کے فلسفے کی روشنی میں ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں۔؟

جواب

پہلی بات تو یہ سمجھنی چاہیے کہ بینکنگ پوری معیشت نہیں ہے۔ معاشی نظام کا ایک حصہ ہے۔ بینک کا بنیادی تصور تو یہ ہے کہ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی بچتیں جمع ہوتی ہیں اور اُن بچتوں کی بنیاد پر وہ تشکیلِ سرمایہ کا کام کرتے ہیں۔ اور بینک وہ سرمایہ کسی سرمایہ دار کو، یا دیگر لوگوں کو استعمال کرنے کے لیے یا حکومت کو قرضوں کو شکل میں دیتا ہے۔ گویا کہ وہ تشکیلِ سرمایہ کی ایجنسی ہے جو سرمائے کی فراہمی کے لیے سرمایہ داری نظام نے بنائی ہے۔ اس کا تعلق نہ براہِ راست پیدائش دولت سے ہے، نہ تقسیم دولت سے ہے، نہ تبادلہ دولت سے ہے، اور نہ صرفِ دولت ہے۔ یہ اس کے ایک شعبے یعنی زر کو کنٹرول کرنے کے معاملے میں کام کرتی ہے۔ زر کی گردش کے حوالے سے، بنیادی کام بھی سٹیٹ بینک کرتا ہے، خواہ وہ زرعی پالیسی بنانے کے حوالے سے ہو، یا کسی اور حوالے سے۔

اب اگر کسی ملک میں پیدائش دولت کیپٹل اِزم کے اصول پر ہو، تقسیم دولت، تبادلہ دولت اور صرفِ دولت سرمایہ دارانہ اصول پر ہو تو محض ایک ایجنسی، جو سرمائے کو منظّم (regulate) کرنے کی اتھارٹی ہے، اس کو اسلامی بنالیا جائے یا غیر اسلامی رہے، کیا یہ بحث منطقی ہے؟ ہم سب کو معلوم ہے کہ یہ بینکوں کو اسلامی بنانے کے لیے جو تگ و دو شروع کی گئی تھی، یہ ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں ہوئی۔ جب بینک اسلامی بنانے یا اسلامی معاشی نظام کو سامنے رکھ کر یہاں بات چلی تو دو کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ایک ٹیکنیکل کمیٹی تھی، ماہرینِ معاشیات پر مشتمل۔ جس کے سربراہ اُس زمانے کے بیوروکریٹ غلام اسحاق خان تھے۔ اور دوسری کمیٹی مولانا تقی عثمانی کی سربراہی میں علما کی بنائی گئی تھی کہ اسلام کا معاشی نظام یا بینکنگ سسٹم بنا کر دیں اور اُن سے کہا تھا کہ آپ اس کو عمل میں لانے کا جو ٹیکنیکل ڈھانچہ ہے وہ بیان کریں۔

دونوں رپورٹیں موجود ہیں۔ غلام اسحاق خان کی کمیٹی نے جو ٹیکنیکل کمیٹی تھی، اس رپورٹ کے مقدمے میں لکھا ہے کہ اگر آپ واقعی اسلامی معاشی نظام بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو ملک کا پورا معاشی ڈھانچہ بدلنا پڑے گا۔ دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور تمام معاشی سسٹم اور جو پروسیجرز (procedures) ہیں، وہ سب بدلنے ہوں گے۔ تب تو ایک مکمل معاشی نظام چل سکتا ہے۔ اس سسٹم کے اندر رہتے ہوئے صرف ایک بینک کو اسلامائز کیا جائے تو یہ ٹیکنیکلی طور پر ممکن نہیں ہے۔ عملاً یہ ممکن نہیں۔

مولانا تقی عثمانی صاحب کی رپورٹ بھی پڑھ لیں۔ انھوں نے بھی بہ الفاظِ دیگر یہ اعتراف کیا تھا کہ اس سسٹم میں رہتے ہوئے یہ کام نہیں ہوسکتا۔ البتہ ہم اس کو اسلامائزیشن کی طرف لانے کے لیے کچھ حیلے اور کچھ طریقے کر سکتے ہیں۔ اور وہ حیلے علما جانتے ہیں، جیسے ''بیع العینہ'' کا حیلہ ہے۔ اسی طریقے سے اجارہ کو اس کے ساتھ ضم کر کے ''صفقۃ فی صفقۃ'' (معاملہ در معاملہ) کا حوالہ دیا گیا ہے۔ کچھ حیلوں کے ذریعے سے انھوں نے اس کو اسلامی بنانے کی کوشش کی اور اس کے لیے بھی بہت سی کڑی شرائط بنانی پڑیں۔ سات آٹھ شرطیں خود مولانا تقی عثمانی صاحب نے بیان کی تھیں کہ یہ ہوں گی تو یہ بینک کسی درجے میں اسلامی بنے گا، لیکن جب عمل درآمد کا مرحلہ آیا تو علما کو ایک طرف کر دیا گیا اور رپورٹ حوالے کر دی گئی بینکنگ سیکٹر کے ماہرین کے، کہ آپ اس کے مطابق نظام بنائیں۔ تو انھوں نے ان شرائط کو پیشِ نظر رکھے بغیر اُن حیلوں کی اساس پر ایک نظام بنایا تھا، جس پر خود مولانا تقی عثمانی صاحب کی اس زمانے میں تنقید موجود ہے کہ ہم نے شرائط کے ساتھ بات کی تھی، مگر یہ انھوں نے نہیں کیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد کچھ شرائط مانی گئیں۔ پھر بھی ترمیمات کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور ابھی بھی اُن حیلوں میں وہ تمام شرائط کامل طور پر، پوری طور پر نہیں سامنے آئیں۔ نجی مجلس میں مولانا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم جس طریقے سے چاہتے تھے، ویسا نہیں ہے، لیکن بس اس کو یوں سمجھا جائے کہ ایک اسلامی معاشی نظام کی طرف بڑھنے کی ایک ابتدائی ناقص اور ادھوری سی ایک کاوش ہے۔ تو یہ کوئی مکمل اسلامی بینکنگ نہیں ہے۔

دیکھیے! ہر سسٹم کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ مثلاً کرولا کار کے اندر سوزوکی کا پرزہ لگا سکتے ہیں؟ نہیں لگا سکتے۔ اسی طرح سرمایہ داری ایک مکمل نظام ہے۔ بینک اس کا ایک کل پرزہ ہے۔ سوشلزم ایک مکمل نظام ہے۔ اس کے شعبے، اس کے پرزے اپنے ہیں۔ اسلام کا اپنا ایک معاشی نظام ہے، اس کے اپنے کل پرزے ہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک سسٹم کا ایک پرزہ نکال کر دوسرے میں لگا کر کہیں کہ یہ رواں ہوگیا۔ کیسے ہوگیا؟ اب میزان بینک وہی قرضہ دیتا ہے جو عام بینکنگ والا ہے، وہ بھی قرضہ دیتا ہے۔ میزان کا قرضہ مہنگا، دوسروں کا سستا۔ کیوں؟ اور پھر اگر وقت پر اُس نے قرضہ ادا نہ کیا تو عام بینک تو سود وصول کرتا ہے دُگنا تگنا جو بھی طے ہو۔ تو میزان والوں نے حیلہ بنایا کہ جبر فی التبرّع یعنی زبردستی ان سے کہا جائے کہ خیرات (charity) میں حصہ لو۔ اور وہ چیریٹی بھی ہمارے بینک میں جمع کرانی ہے، باہر نہیں دے سکتے۔ تو گویا کان ادھر سے نہیں پکڑا، ادھر سے پکڑ لیا۔ انھوں نے سود لیا ہے اُتنی شرح میں، آپ نے اس کو چیریٹی قرار دے کر لے لیا۔ تو کیا شریعت کے اندر تبرع یا ہدیہ اور صدقہ جبری طور پر لیا جاسکتا ہے؟ یہ تضادات ہیں۔ اس لیے اس کا ابھی مزید جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جب تک سسٹم کے باقی امور سامنے نہ ہوں، تو کسی ایک چیز کو ہم اسلامی نہیں کہہ سکتے۔

سوال

پاک چائنہ اکنامک کوری ڈور CPEC سے معیشت کے اندر ایک نیا موڑ آیا ہے۔ اس تناظر میں

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حوالے سے آپ کیا رہنمائی دیں گے؟ اقوامِ عالم کے ساتھ تجارت کے تناظر میں اگر دیکھ لیا جائے۔؟

جواب

اللہ کرے کہ اس کا فائدہ آپ کے ملک کو ہو جائے۔ خوشیاں تو ہم بہت منا رہے ہیں کہ چھیالیس ارب ڈالر چائنہ سے ہمارے پاس آ رہے ہیں۔ لیکن دیکھئے! دنیا میں آپ کسی سے بھی قرضہ لیں یا کسی کے ساتھ بھی مل کر کوئی معاہدہ کریں، وہ نفع بخش (fruitful) تب ہوتا ہے کہ جب ہمارے ہاں اپنا ایک مضبوط اور مستحکم سسٹم ہو، ہمارے ادارے فعال ہوں اور ہم اُس سے نتیجہ پیدا کرنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہوں تو پھر تو ترقی اور کامیابی ہوتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اُس کا نتیجہ دوسرا ملک، جو آپ کو اپنے مفادات کے لیے پیسہ دے رہا ہے، وہ فائدہ اٹھائے گا۔ اب سی پیک سے سب سے زیادہ فائدہ چائنہ کا ہے کہ اُسے پچاسی فی صد سفر کی رعایت مل جائے گی اس کے مقابلہ میں کہ باہر سے، بحر الکاہل سے ہو کر اُس کا مال جاتا تھا، اب وہ صرف پندرہ فی صد راستہ استعمال کرے گا۔

ابھی آپ نے پچھلے سال (2016ء) ایک قافلہ (convoy) گزارا ہے، تو وہ اٹھارہ دنوں میں خنجراب سے گوادر کے گرم پانی میں پہنچے۔ یہاں چائنہ سے بحر الکاہل کے راستے سے آتا تھا تو تقریباً ایک مہینہ لگتا تھا۔ ان دنوں کا پیٹرول، جہاز کا خرچہ اور دیگر جو لیبر ہے وغیرہ، ان سب کی بچت اس کو ہوئی۔ آپ کو کیا ملا ہے؟ اس کے ساتھ ایک ڈویژن فوج تھی (ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا، میں اس وقت بنوں میں تھا، ہمارے سامنے سے وہ قافلہ گزرا) تو آپ دیکھئے کہ وہاں صرف فوج کو اس کا معاوضہ ملے گا کہ فوج پورا کا پورا ڈویژن اس کے اوپر تعینات ہے۔ اب فائدہ تو تب ہو کہ ہمارے ہاں قومی تقاضوں کے مطابق ان وسائل سے استفادے کا سٹرکچر موجود ہو۔

آپ بتلائیے کہ چالیس ارب ڈالر کا معاہدہ چینی صدر آپ کے ساتھ کر کے جاتا ہے اور وہ خنجراب سے گوادر تک سڑک بنا رہا ہے۔ اور یہاں سے جاتے ہی اگلے مہینے وہ انڈیا پہنچ گیا۔ مودی (بھارتی وزیر اعظم) کے آبائی شہر احمد آباد گجرات میں اُس نے چھبیس ارب ڈالر کا معاہدہ کیا بلٹ ٹرین کا، جو کلکتہ سے چلے گی اور امرتسر آئے گی۔ اور اُس ٹرین کے نتیجے میں آپ بتلائیے کہ کلکتہ سے چلنے والی ٹرین امرتسر آ کر کیا کرے گی؟ امرتسر پر آ کر تو سرحد بند ہو گئی۔ تو کیا یہ کسی نہ کسی گریٹ گیم کا حصہ تو نہیں ہے؟ کہ کل کو یہی دروازہ کھلے اور آ کر آپ کے سی پیک کے ساتھ مل جائے۔ اور یہاں سے طورخم (افغانستان) چلا جائے تو آپ تو زیادہ سے زیادہ اس راہ داری کا کرایہ وصول کریں گے۔ یہی اب تک کا جو اندازہ اور تجربہ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ قومی سوچ کے ساتھ ہمارا

معاشی ڈھانچہ نہیں ہے۔

پھر ایک اور بات بھی دیکھئے! سٹیٹ بینک کے اہم ترین لوگوں سے جو ہماری میٹنگز ہوئی ہیں، اس کی روشنی میں یہ معلومات ملیں آپ کے جو آڈٹ اور فنانس سے متعلق لوگ ہیں، ان کے بہ قول چائنہ کا یہ پیسہ آپ کے فنانس سسٹم میں داخل ہی نہیں ہوگا۔ کس راستے سے آنا ہے؟ اور کس راستے سے خرچ ہونا ہے؟ یہ صرف یہاں کا حکمران طبقہ جانے یا چین کی کمپنیاں جانیں۔ چینی بینک براہِ راست شریک (involved) ہے۔ جب کہ آپ کے بینکوں میں، آپ کے سٹیٹ بینک میں وہ پیسہ کھاتوں میں نہیں چڑھ رہا کہ آپ کے پاس آیا ہو اور پھر یہاں سے آپ نے اخراجات کے لیے آگے مہیا کیا ہو۔ اگر ملک کے ملکیتی قومی فنانس سسٹم میں پیسہ داخل (inject) ہی نہیں ہو رہا مگر وہ قرضے کے طور پر آپ کے اوپر آ رہا ہے، اس طرح باہر ہی باہر کمپنیوں سے سودے ہو رہے ہیں۔

اس صورتِ حال میں یہاں کی ہر جماعت کے سیاسی مافیاز کا مطالبہ کیا ہے؟ چھوٹے صوبوں کا بھی یہی مطالبہ ہے کہ ہمیں روٹ بتاؤ کون سا ہے؟ تا کہ اُس روٹ پر غریبوں سے سستی زمینیں خرید لیں اور پھر مہنگے داموں سی پیک کو بیچیں۔ خنجراب سے لے کر گوادر تک، اس روٹ کے اوپر پورا دیکھ لیجیے۔ جیسے ہی روٹ کا اعلان ہوا ہے، یہاں موجود جتنے بھی سیاسی نمائندے کسی بھی پارٹی کے تھے، نون لیگ کے ہوں، پیپلز پارٹی کے ہوں، عمران خان کے ہوں، مولانا صاحب کے ہوں، تمام نے غریبوں سے اونے پونے داموں زمینیں خریدی ہیں اور اس کو آگے فروخت کر کے کمانے کے منصوبے ہیں تو وہی مافیاز جو سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے پہلے سے وسائل پر قابض ہے، یہ فائدہ اُن کا ہوگا۔ عوام کا فائدہ تو تب ہوگا کہ جب عوامی مفاد یا رائے کلی کے تناظر میں سسٹم بنے۔ اخلاقِ فاضلہ کے تقاضوں پر سسٹم بنے۔ ٹیکنالوجی کا استعمال ملک کے قومی مفاد کے تناظر میں ہو تو ولی اللّٰہی نقطہ نظر سے سی پیک درست ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں تو ولی اللّٰہی نقطہ نظر سے سرمایہ داری نظام کا آلہ کار رہے گا۔

سوال

اسلام جب آیا تو وہ تھیسز (Thesis) کس سسٹم کا تھا؟ اور اس کے بعد پھر اینٹی تھیسز (Anti thesis) کیا آیا اُس کا؟ اور اگر اینٹی تھیسز آتا ہے تو دنیا اسے قبول کر سکتی ہے؟ اور اگر نہیں کر سکتی تو اسلام کے بعد جو تھیسز بنے، اور ہم دوبارہ اسلام کو دوبارہ تھیسز کیسے بنا سکتے ہیں؟

جواب

یہ جو بات کی گئی تھی، وہ مارکسزم یا ہیگل کے فلسفے کے نقطہ نظر سے بیان کی گئی تھی۔ اسلام کا نقطہ نظر تو یہ نہیں ہے کہ انسانیت میں جدل کو تسلیم کیا جائے یا اس جدلیت کی اساس پر اس میں سے کوئی مشترکہ امر یا

Synthesis نکالا جائے۔ یہ تو مقدمہ ہی سرے سے غلط ہے۔ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ کل انسانیت، نوع کے اعتبار سے ایک وحدت لیے ہوئے ہے۔ اور انسانی تقاضوں میں کالے، گورے، مشرقی، مغربی، مسلمان، غیر مسلم کا اپنے معاشی تقاضوں کے حوالے سے آپس میں کوئی جدل نہیں ہے۔ ہر انسان کو بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے، گرمی سردی سے بچاؤ کی ضرورت ہے، اس کی معاشی ضروریات ہیں۔ وہ معاشی ضروریات بلاتفریق رنگ، نسل و مذہب، وحدتِ انسانیت کی اساس پر کل انسانیت کی معاشی ضروریات کے مہیا کرنے کا جو وسائل معاش کا نظام ہوگا، وہ اسلامی نظامِ معیشت کہلائے گا۔

انسانوں میں پہلے جدل ماننا اور پھر جدل کی بنیاد پر سن تھیسز کا تصور لانا اور پھر اس کو تھیسز قرار دینا، یہ مارکسزم کی فلاسفی تو ہوسکتی ہے، اسلام کا نقطہ نظر تو نہیں ہے۔ کیا آج سے چودہ سو سال پہلے یا کئی ہزار سال پہلے انسان کو بھوک نہیں لگتی تھی؟ یا کم لگتی تھی؟ یا گرمی سردی سے بچاؤ کی اس دور میں اَور کوئی ضرورت تھی اور آج اَور ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان کے نوعی تقاضوں میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ جب ان نوعی تقاضوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تو اس حوالے سے وہ وحدت ہے لہٰذا قیامت تک کے لیے چودہ سو سال پہلے اس کی ضروریات کی تسکین کا جو مجموعی ڈھانچہ اسلام نے دیا ہے، اس کی اہمیت آج بھی اُسی طریقے سے برقرار ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ ذرائع پیداوار میں تبدیلی آئی ہے تو وہ آنی بھی چاہیے اور وقت کے ساتھ ساتھ آتی رہتی ہے۔ اب اُن ذرائع پیداوار یا اُس ٹیکنالوجی کو کل انسانیت کے مفاد کے لیے بنانا، یہ اسلام کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ جو بھی ٹیکنالوجی آئے، اس کے تناظر میں احتیاجات کا تعین کریں اور اُسی کے مطابق ہی ان وسائل کو پیدا کر کے اُن وسائل کے ذریعے سے احتیاجات کی تسکین کا نظام بنائیں۔

سوال

آپ نے بڑے خوب صورت انداز میں اسلام کا معاشی نظام، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ کیپٹل اِزم اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلام بالکل different اور اعلیٰ اور ارفع نظام ہے، لیکن ہمارے سامنے ایک اَور مسئلہ یہ آتا ہے کہ فکرِ ولی اللّٰہی کے ایک بڑے شارح تھے مولانا عبیداللہ سندھیؒ (1944ء) اُن کے بارے میں عمومی طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ روس کے سوشلزم سے متأثر ہوگئے تھے اور انھوں نے ان کے نظریات کے پرچار کے لیے کام کیا۔ یہ شبہ کس حد تک درست ہے؟ اس کی وَجہ کیا ہے؟

جواب

اس کی وَجہ یہ ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ حریت پسند اور freedom fighter تھے۔ برطانوی

سامراج کے خلاف انھوں نے آزادی کی جنگ لڑی۔ چوبیس پچیس سال باہر رہ کر اور پندرہ بیس سال ہندوستان میں رہ کر یہ جدوجہد اور کوشش کی۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں اُن پر تحریک ریشمی رومال کے تناظر میں ایک مقدمہ دائر ہوا تھا ''ملکہ معظّمہ بنام عبیداللہ سندھی''۔ اُس مقدمے میں مولاناؒ کو مجرم قرار دیا تھا برطانوی شہنشاہیت نے۔

مولاناؒ جب مجرم قرار پائے تو مولانا کا ملک میں داخلہ بند ہو گیا کہ وہ غدار ہیں اور بغاوت انھوں نے کی ہے، لہٰذا وہ اس ملک میں نہیں آسکتے۔ انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت جب یہاں سیاسی آزادی اور جماعتوں کو الیکشن لڑنے کی اور صوبائی حکومتیں بنانے کی اجازت دی گئی تو پھر یہاں کے سیاسی لیڈروں نے بالخصوص مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور کانگریس کے لیڈروں نے باقاعدہ طور پر برطانیہ کو درخواست کی کہ ہمارے جتنے بھی باہر کے جلاوطن لوگ سیاسی لیڈر ہیں، ان کو واپس آنے کی اجازت دی جائے کیوں کہ سیاسی آزادیاں ہوں گی، الیکشن تبھی لڑا جائے گا۔ اُن میں سے چوں کہ مولانا سندھیؒ اپنے آپ کو سندھ صوبہ سے وابستہ کر چکے تھے تو سندھ کانگریس کے صدر تھے، پنڈت چوئتھ رام، تو انھوں نے حکومتِ برطانیہ کو باقاعدہ آفیشل لیٹر لکھا کہ ہمارے سندھ کے ایک رہنما مکہ معظّمہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کو واپس لایا جائے۔

برطانیہ سرکار نے اُس کے جواب میں خط دیا کانگریس کے پریزیڈنٹ کو اور اُس میں اُس نے لکھا کہ مولانا سندھیؒ کمیونسٹ ہو چکے ہیں۔ وہ روس گئے تھے اور انھوں نے سوشلزم قبول کر لیا۔ سوشلزم اور ہمارے سرمایہ داری نظام، دونوں کے درمیان جنگ ہے، اور ہم اپنے کسی بھی دشمن کو اپنے ملک میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتے اور دو چار مزید اعتراضات اُن پر کیے۔

تو پنڈت صاحب نے جو کانگریس کے صدر تھے، انھوں نے حضرت سندھیؒ کو ایک خط لکھا، جو آج بھی کراچی نیشنل میوزیم کے آرکائیو میں محفوظ ہے تو مولانا سندھیؒ نے 18 صفحات پر مشتمل اس کا جواب دیا۔ اُس میں خاص طور پر یہ الزام کہ حکومتِ برطانیہ نے کہا ہے کہ آپ سوشلسٹ ہیں اور آپ نہیں آسکتے، تو مولانا نے اس کا جواب لکھا کہ

میں روس گیا۔ وہاں رہا اور سوشلزم کا مطالعہ میں نے کیا۔ یہ بھی کہا کہ میں شروع میں یورپین زبان نہیں جانتا تھا۔ میں نے اپنے رُفقا کے ذریعے سے سوشلزم کا مطالعہ کیا مثلاً ظفر حسن ایبک وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ میرا علمی اور قانونی حق ہے کہ دنیا کے کسی بھی علم و فکر یا کسی بھی نظام کا میں مطالعہ کروں۔ اس پر کوئی دنیا میں پابندی (ban) نہیں لگا سکتا۔ جہاں تک قبولیت کی بات ہے تو یہ دعویٰ غلط ہے۔ میں نے کبھی بھی کیمونزم یا سوشلزم کو اپنا نصب العین قرار نہیں دیا۔ میرا عقیدہ اور نصب العین (creed) اسلام ہے اور اس اسلام کی میں وہ تعبیر مانتا ہوں، جو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی ہے۔ اس سلسلے میں میرے دو استاد ہیں: ایک شاہ ولی اللہ اور دوسرے

میرے اپنے براہِ راست استاد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ۔ میں ان دونوں کی تعبیر کا اسلام مانتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ باقی لوگوں کی جو تعلیماتِ اسلام ہیں، میں ان کو تسلیم کروں۔

اور میں حکومتِ برطانیہ کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنی کسی سی آئی ڈی کی رپورٹ سے یا اپنی کسی دستاویز سے یہ ثابت کرے کہ میں نے کبھی اور کسی بھی مرحلے پر سوشلزم قبول کیا ہو۔ میرے جیسا دبنگ آدمی چھپ کر کوئی بات نہیں قبول کیا کرتا۔ مجھے جب پتہ چلا کہ میرا ہندو دھرم یا سکھ دھرم میرے مسائل حل کرنے کا قائل نہیں ہے تو میں نے بہ بانگِ دُہل ماں چھوڑی، بہن چھوڑی غرض ہر چیز چھوڑی، میں نے اسلام قبول کرلیا اور اگر روس جا کر مجھے ایک لمحے کیلئے بھی معلوم ہوتا کہ اسلام میرے مسائل کا حل نہیں ہے تو میں بہ بانگِ دہل اعلان کر دیتا کہ میں آج کے بعد اسلام چھوڑتا ہوں اور میں کمیونسٹ ہوگیا۔ لہٰذا میرے بارے میں غلط معلومات ہیں۔ یہ مولانا نے خط لکھا اور اُس خط کو بنیاد بنا کر پنڈت صاحب کا برطانیہ سے پھر اگلا ڈائیلاگ ہوا اور مولانا 1939ء میں یہاں آئے۔ کمیونسٹ ہونے کا یہ الزام سب سے پہلے لگایا برطانوی حکومت نے۔ مولانا سندھیؒ یہاں آکر آرام سے تو نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے یہاں کی سیاست میں حصہ لینا تھا۔ یہاں چاہے کسی پارٹی میں ہوتے، کانگریس میں تو پہلے سے تھے، مولانا انڈین نیشنل کانگریس کابل کی شاخ کے صدر بھی رہے تو انھوں نے آزادی اور حریت کی بنیاد پر کام کرنا تھا۔ تو اس میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے ایک تو شرائط کے ساتھ مولانا کو یہاں لایا گیا اور دوسرا مولانا چوں کہ متحرک آدمی تھے، اور اُن کی تحریک سے برطانیہ کی حکومت ہلتی تھی، تو اس لیے برطانیہ نے ان کے خلاف لوگوں کے ذریعے سے یہ پروپیگنڈا کرایا کہ مولانا کمیونسٹ ہوگئے اور کیمونزم کی باتیں کرنا شروع کردی ہیں۔ کیا کوئی آدمی مولانا کی اپنی کسی تحریر سے یہ بات واضح کرسکتا ہے کہ مولانا نے کیمونزم یا سوشلزم کی بات کہی ہو؟ کوئی نہیں! یہ سب پروپیگنڈا ہے جو جھوٹ پر مبنی ہے۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک سیاسی الزام تراشی ہے جو کسی دوسرے کو فیل کرنے کے لیے اور کام نہ کرنے دینے کے لیے کی جاتی ہے۔

اور پھر مولانا نے آکر یہاں جو جدوجہد شروع کی اور ولی اللّٰہی فکر کی اساس پر سیاسی، معاشی، سماجی، علمی کام شروع کردیا تو اس سے برطانوی سسٹم نے لرزنا تھا۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ مولاناؒ کیمونسٹ تھے یا کیمونزم کی بات کرتے تھے کیوں کہ ہندوستان میں مولانا سندھیؒ کے آنے کے بعد ان کے خلاف دو طبقے تھے، ایک تو وہ جو نام نہاد اسلام پسند یا رجعت پسند علما تھے، انھوں نے کہا کہ یہ کیمونسٹ ہوگئے۔ اور دوسرا اگر کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں، اس نے باقاعدہ سرکلر جاری کیا کہ ہمارا جو بھی کامریڈ ہے، وہ کسی بھی مولوی سے مل سکتا ہے، سوائے عبیداللہ سندھیؒ کے۔ ہر مولوی سے آپ مل سکتے ہیں کیوں کہ اُس کی رجعت پسندی کا توڑ کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر نہیں مل سکتے تو عبیداللہ سندھیؒ سے لاہور میں گنگا رام مینشن میں حکیم محمد قاسم صاحب اپنے

مطب میں بیٹھتے تھے۔ وہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی کے فارغ التحصیل تھے اور حکیم اجمل خان کے شاگرد تھے۔ خود انھوں نے ہمیں اپنا واقعہ سنایا کہ میں کامریڈ بن گیا اور کمیونسٹ پارٹی میں چلا گیا۔ ہم اس کے سٹڈی سرکل میں شریک ہوتے تھے۔ اب چوں کہ ہم کمیونسٹ تھے تو ہمارے ماں باپ ظاہر ہے کہ مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے تھے تو ہمارے خلاف خاندان کے اندر بڑا ردِ عمل تھا۔ اور ماں باپ بھی ہم سے چھوٹ گئے کہ ہم اپنے انقلابی جوش میں کمیونسٹ بن چکے تھے تو ایک دن وہ خط پڑھا گیا ہمارے سٹڈی سرکل میں کہ یہ مرکز سے آیا ہے۔ یہ تمام کامریڈوں کے نام ہے کہ وہ ہر مولوی سے مل سکتے ہیں مگر عبید اللہ سندھیؒ سے نہیں مل سکتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انسان کو جس چیز سے روکا جائے، انسان اُدھر ضرور بھاگتا ہے۔ تو ہم نے کہا کہ یار ایسا کیسا مولوی ہے! جس سے کمیونسٹ بھی ڈرتے ہیں تو کیوں نہ اُس سے ملا جائے؟ تو ہم گئے مولانا سندھیؒ کے پاس۔ اب جب مولاناؒ سے بات چیت ہوئی اور ولی اللّٰہی فلاسفی پر انھوں نے گفتگو کی تو ہماری تو آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے کہا کہ بھئی! ہمارا ایمان تو بچتا ہے اور ہمارا مقصد تو غربت کا خاتمہ اور ظلم و ستم کو ختم کرنا تھا، اگر ہم کمیونسٹوں میں رہ کر یہ کام کریں تو اس میں تو ہمارا ایمان جاتا ہے۔ یہاں ایمان بھی بچتا ہے اور غریبوں کے لیے کام بھی ہوتا ہے۔ آم کے آم، گٹھلیوں کے دام۔ ہم تو مولانا سندھیؒ کے عاشق ہو گئے۔ تو ہم نے کمیونسٹ پارٹی چھوڑی اور مولانا کے شاگرد بن گئے۔ تو یہ عجیب کمیونسٹ ہے کہ جس پر کمیونسٹ پارٹی کہتی ہے کہ یہ مولوی اتنا شدت پسند ہے کہ ہمارے جدید لبرلزم اور کمیونزم کو توڑ رہا ہے اور ماشاءاللہ! علما کہتے ہیں کہ یہ کمیونسٹ ہیں۔

سوال

آپ نے اسلامی معیشت کی بنیاد محنت کو قرار دیا ہے، جب کہ آج مشینی دور ہے۔ اس مشینی دور میں محنت تو تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ اس مشینی دور میں کیا رہنمائی ہوگی؟

جواب

انسانی محنت کے بغیر تو کوئی بھی کام نہیں ہوتا۔ مشین بھی ایجاد ہو جائے تو مشین کو چلانے کے لیے دیکھ بھال اور نگرانی کا نظام تو بنانا پڑے گا۔ اصل سوال یہ ہے کہ جو ٹیکنالوجی بھی دریافت ہوئی ہے، اس کا مفاد کس کو ہونا چاہیے؟ کیا اجتماع کو یا ایک مخصوص طبقے کو؟ انسان اس دنیا میں جب تک ہے تو ہر ایک ٹیکنالوجی کے استعمال کے لیے انسانوں کی ضرورت رہے گی لہٰذا جو ٹیکنالوجی بھی دریافت ہو، تو اس کے نتیجے میں فائدہ تمام انسانوں کو ہونا چاہیے۔ یہ ایک مخصوص طبقے کے لیے نہیں۔

☆..........☆

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دھلویؒ

فرماتے ہیں

من فقه الرجل ان ینظر الیٰ حاجاته فلیختر کسباً یکفی لها.

(انسان کی دانش اور شعور کا تقاضہ ہے کہ اپنی حاجات کا تعین کرے اور ان کے لئے کفایت کرنے والے پیشہ کا انتخاب کرے) مثلاً اس کا گھر چلانے کے لیے، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے، کس طرح کے وسائل کی ضرورت ہے۔ اور اُن وسائل کے مطابق اُسے کیا پیشہ اختیار کرنا ہے۔ شاہ صاحب نے پیشوں کے لیے بنیادی جو دائرے متعین کیے ہیں وہ اصول المکاسب، یعنی تمام پیشوں کے بنیادی اساسی اصول تین ہی ہیں: زراعت، صنعت اور تجارت۔ اور اس سے پھوٹنے والے اس کے ذیلی شعبے ہیں۔ اور پھر ان تینوں شعبوں کو منظم کرنے والا ادارہ ریاستی نظام، یا انتظامیہ جو داخلی سلامتی کے ادارے اور باہر کے حملہ آوروں سے بچانے کے لیے عسکری یا فوجی قوت کی صورت میں یا انتظامی نظم و نسق چلانے والوں کی صورت میں ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس تناظر میں سوسائٹی میں دولت کی پیدائش کا عمل ہموار طریقے سے آگے بڑھنا چاہیے۔

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ تمام انسان مدنی الطبع ہیں۔ اجتماعیت کی سوچ رکھتے ہیں۔ اس لیے لازماً تمام لوگوں میں، اللہ نے **ایجاب التعاون** کا فیصلہ جاری کر دیا ہے، یعنی تعاونِ باہمی واجب لازمی اور ضروری ہے۔ تعاونِ باہمی ہے تو درست، اور اگر تعاونِ باہمی نہیں ہے، اختلاف و انتشار ہے، ہر آدمی دوسرے کو کہنی مار کر پیچھے گرانا چاہتا ہے اور خود آگے بڑھنا چاہتا ہے تو یہ بنیادی طور پر دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور صَرف کے تمام اصولوں کے تناظر میں غلط ہے۔

پیدائش دولت کے عمل میں بھی تمام لوگ شریک ہوں گے، سوائے مجنون و پاگل کے۔ اور اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی واضح کیا۔ آپ ﷺ مسجد نبوی میں بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان کندھے پر رسّی اور کلہاڑی رکھے جنگل میں لکڑیاں کاٹنے، محنت مزدوری کرنے جا رہا ہے۔ تو کچھ صحابی بیٹھے آپس میں بات کرتے ہیں کہ یہ کتنا محروم شخص ہے کہ امام الانبیا کا وعظ ہو رہا ہے اور یہ دنیا کی طرف بھاگا دوڑا جا رہا ہے۔ حضور ﷺ نے اُن سے کہا کہ کیا بات کی تم نے؟ آپ ﷺ خود تو سن چکے تھے، لیکن مجمع کو سنانے کے لیے کہا کہ کھڑے ہو کر بتاؤ۔ انھوں نے اپنی بات دہرائی۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو! اگر یہ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں اور گھر والوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جا رہا ہے تو یہ ایسے ہی فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) ہے، جیسے تم فی سبیل اللہ ہو۔ اور اگر یہ کسی دُنیاوی مفاد اور محض دولت کی ہوس اکٹھا کرنے کی نیت سے جا رہا ہے تو پھر تم فی سبیل اللہ اور وہ فی سبیل الشیطان ہے۔

صدارتی کلمات

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا
سابق چیئرمین شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم. نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم. اما بعد قال اللہ تبارک و تعالیٰ فی کلامہ المجید و الفرقان الحمید: من اَعرض عن ذکری فاِنّ لہٗ معیشۃً ضنکا. صدق اللہ العظیم.

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس نے بھی میرے ذکر سے منہ موڑا، یقیناً ہم اُس کے لیے معیشت کو تنگ کردیں گے۔ آج کا عنوان معیشت کے حوالے سے ہے اور شاہ ولی اللہؒ کی فکر کے حوالے سے آپ نے سنا۔ اس اتنے بڑے دل پذیر خطبے اور اتنی خوب صورت باتوں کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی گنجائش ہے۔ تاہم ایک بات ضرور اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: جو ہمارے ذکر سے منہ موڑے گا، تو اس کی معیشت تنگ ہوگی۔ یہاں ذکر سے مراد اصول ہیں۔ جب ہم اُن اصولوں پر عمل کریں گے، جب ہم معیشت کے اصولوں پر اُس کی اصل کتاب کے مطابق کام کریں گے تو یقیناً ہماری معیشت مضبوط ہوجائے گی۔ آج ہمارے جو اصول ہیں، ہم ان کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔

امریکا میں ایک پروفیسر سے ملاقات ہوئی تو اسلام کے معاشی نظام پر کافی گفتگو رہتی تھی۔ میرا دوست تھا۔ ہم چائے اکٹھے پیا کرتے تھے۔ تو میں نے کہا کہ اسلام کا یہ جو نظامِ معیشت ہے، وہ تمام نظاموں سے بڑھ کر ہے اور اس کے پاس تمام مسائل کا حل موجود ہے، جس سے کسی بھی سوسائٹی کو اچھے طریقے سے چلایا جاسکتا ہے۔ تو ظاہر ہے وہ میری بات سے بڑا چونکا۔ اس نے کہا: کیا آپ کے پاس ایک نظام موجود ہے؟ میں نے کہا: بالکل موجود ہے۔ اس نے کہا کہ ہم اس بات کو نہیں مانتے کہ آپ کے پاس اسلام کا نظامِ معیشت ہے۔ ہاں! بس چند اصول ہیں آپ کے پاس، آپ ان اصولوں کو لے کر پھر رہے ہیں، اور آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بس یہ بہرحال ایک چیلنج ایبل (challengeable) لمحۂ فکریہ تھا میرے لیے کہ جس طرح ہماری تاریخ، ہمارا دین، ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور قرآن مجید کی جو تعلیم ہے، ان کو اس نے مسترد (reject) کردیا۔

اصل لمحۂ فکریہ ہے کہ اتنا بڑا نظام جو ایک ہزار سال تک جس کا محترم مفتی صاحب نے بات بھی کی ہے، وہ قابلِ

عمل رہا اور وہ نظام برصغیر کے حوالے سے بھی ایک مضبوط اور پائیدار رہا۔ تو اب کیا مسئلہ ہو گیا ہے کہ آج ہم اس معیشت کے نظام کو کیوں نہیں دنیا کے نظام پر غالب کر سکے؟ تو جہاں جہاں کمزوریاں ہیں، مفتی صاحب نے اُن کی نشان دہی کر دی ہے کہ ان کمزوریوں کے ازالہ کے طریقہ ہائے کار پر اگر ہم چلیں گے تو ہمارا نظام بھی مضبوط ہو جائے گا اور ہم بیرونی معیشت کے مقابلے میں جو ہمارا اپنا نظامِ معیشت ہے، اس کو ہم اس ستوار کریں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے مقابلے پر ہم اُن اصولوں کو سمجھیں اور اُن پائیدار اصولوں پر عمل کریں، جو شاہ ولی اللہ نے آج سے دوسو سال پہلے ہمیں بتائے تھے اور آج کی جو جو ضرورت ہے، اس ضرورت پر ہمیں عمل پیرا ہونا ہوگا۔ تب جا کر ہم کوئی کامیابی کی منزل طے کر سکتے ہیں۔

بہرحال بہت اچھی باتیں ہوئی ہیں، اب مزید اس پر کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آج کی اس تقریب، جو موسیٰ پاک شہید چیئر کے زیر اہتمام ہوئی ہے، میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کے جتنے بھی منتظمین ہیں، ان کا بھی میں شکریہ ادا کرتا ہوں، جس لیکچر کا اہتمام کیا گیا ہے، وہ ہمارے طلبا کے لیے، طالبات کے لیے، ہمارے پی ایچ ڈی اور ایم فل کے طلبا کے لیے اور اساتذہ کے لیے بھی میں سمجھتا ہوں کہ ایک رہنمائی کا ریسورس (resource) ہے۔ اور فکری، سماجی اور معاشی رویوں میں ہمیں چینج (change) کی ضرورت ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ ہم جب سے تعلیم کے نظام میں آئے ہیں، لیکچرز ہی سنتے آئے ہیں، لیکن الحمدللہ! جو آج کا لیکچر ہے، اور اس سے پہلے کے جو لیکچرز ہیں، میں جناب مولانا مفتی عبدالخالق صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُن کے علم کی قدر کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک ایسا تجزیہ پیش کیا ہے جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر سے ہم آہنگ ہو کر ہمیں اسلامی اصولوں پر چلانے کے ان شاء اللہ قابل بنائے گا۔ آخر میں مَیں تمام طلباء و طالبات کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے بڑے تحمل سے اور بڑی برداشت کے ساتھ اپنے آپ کو وقف کرتے ہوئے ایک لمحہ بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ انھیں کوئی بوریت کا شائبہ ہو رہا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ ہمیں اسلامی اصولوں پر اور اسلام کے خصوصاً نظامِ معیشت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیوں کہ یہی ایک نظام ہے۔ بڑا افسوس ہوتا ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نظام سرمایہ دارانہ نظام کی شکل میں ہم پر زبردستی مسلط ہے۔ اور ہم طوعاً و کرہاً اس پر عمل کیے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مشکل سے نجات دلائے۔ آمین!

☆

چوتھا لیکچر

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ
کا نظریۂ اِرتفاقات

مؤرخہ 20/اپریل 2017ء بروز جمعرات

صدارت

پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد چوہدری

قائم مقام وائس چانسلر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

نظامت

پروفیسر ڈاکٹر محمد ادریس لودھی

ڈائریکٹر سیرت چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ، زکریا یونیورسٹی ملتان

تلاوتِ کلامِ پاک

حافظ محمد رمضان

ایم فل سکالر

نعت رسولِ مقبول ﷺ

قاریہ نسرین اختر

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علومِ اسلامیہ، زکریا یونیورسٹی ملتان

تمہیدی کلمات

پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن
مسئول موسیٰ پاک شہید چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

نحمدهٗ و نصلّی علیٰ رسوله الکریم.

محترم سامعین و سامعات! جس موضوع پر یہ لیکچر سیریز آپ کے سامنے ہو رہی ہے، اس کا جو بنیادی مقصد ہے، اس سے میرا خیال ہے کہ آپ اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہوں گے کہ ہمیں اس بات کی بنیادی طور پر فکر کرنی ہے کہ اس وقت مجموعی طور پر دنیا میں مسلمان مغلوبیت سے دوچار ہیں اور اس مغلوبیت سے نکلنے کے لیے یقیناً جذبات بھی موجود ہیں اور کاوشیں بھی ہیں، لیکن نتائج اس کے مطابق نہیں۔ تو اصل مقصد ہمیں اس بات کو پانا ہے کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟ جذبات ہمارے ہاں بے پناہ ہیں اور بہت سے موقعوں پر اس کا ہم ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ قربانی کا جذبہ بھی ہے، مال خرچ کرنے کا جذبہ بھی ہے، جان دینے کا جذبہ بھی ہے، جان لینے کا جذبہ بھی۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود، قربانیوں کے باوجود صورتِ حال میں بہتری کے آثار نہیں ہے۔ ایک زوال ہے کہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔

اس کا ہمیں اعتراف کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے ایک مخصوص دائرے میں رہ کر سوچتے رہیں گے تو نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ جب ایک طرف ہم یہ دعویٰ رکھتے ہیں اور حقیقت بھی ہے کہ دینِ اسلام پوری انسانیت کا دین ہے۔ یہ دین معاشرت کا دین ہے۔ یہ دین سیاست کا دین ہے۔ یہ دین معیشت کا دین ہے۔ اَخلاق کا دین ہے۔ یہ سارے ہمارے اظہارات ہیں کہ ہم ان کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن سوال یہی آتا ہے کہ ان چیزوں کے حوالے سے ہمارے اندر کتنی سوچ موجود ہے؟ کتنی فکر موجود ہے؟ اس کے لیے کیا حکمتِ عملی موجود ہے؟

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا تذکرہ محض ایک خراجِ عقیدت کے طور پر نہیں۔ اُن کا جتنا بڑا کام ہے، وہ یقیناً اس کام کے سبب اللہ کے ہاں سرخرو ہو چکے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اُن کی جو محنت ہے، ان کا جو فکر ہے، اور خاص طور پر جو اُن کا منہجِ فکر ہے، ان کے سوچنے کا جو ایک انداز ہے کہ کس طرح چیزوں کو دیکھا جائے۔ کس طرح چیزوں پر غور کیا جائے۔ اس اندازِ فکر کی ضرورت ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کچھ باتوں کو یاد کر لیں اور ان کو بغیر سوچے سمجھے دہرانا شروع کر دیں۔ اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اندازِ فکر، وہ نظامِ فکر، وہ طریقۂ فکر ہے کیا؟ اور وہ آج ہمیں کیا سبق دیتا ہے؟ کس طرح آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے؟ اور انھوں نے جو نظامِ فکر دیا، آج اُس کے کیا تقاضے بنتے ہیں؟ جب تک ہم دین کو معاشرے کے دین کے طور پر، زندہ دین کے طور پر اور انسانیت کے دین کے طور پر نہیں

دیکھیں گے، تو پھر نتیجہ گروہیتوں کا نکلتا ہے، فرقوں کا نکلتا ہے، مسلکوں کا نکلتا ہے، اور آپ کو پتہ ہے کہ کوئی بھی فرقہ اور مسلک ہو اس وقت وہ بھی اندرونی طور پر متحد نہیں ہے۔ اُس کے اندر بھی آپ کو بہت ساری دراڑیں نظر آتی ہیں۔ جب ذہنیت ہی جھگڑے کی ہوگی، تنازعے کی ہوگی، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ہوگی اور اپنے آپ کو حرفِ آخر قرار دینے کی ہوگی تو تقسیم کا عمل کہیں نہیں رُکے گا۔ ہر فرقے کے اندر ذیلی فرقے نظر آئیں گے۔ پھر ان ذیلی فرقوں کے اندر مزید آپ کو تقسیم نظر آئے گی اور بات یہاں تک آجاتی ہے، جو مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کہی تھی کہ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کو حق سمجھتا ہے اور اپنے علاوہ سب کو باطل سمجھتا ہے کہ میں جو سوچ رہا ہوں، میں جو کہہ رہا ہوں اور میری جو بات ہے، یہ دین ہے، اور باقی سب مرتد ہیں۔

اس ماحول کے اندر ہمیں اور خاص طور پر جو پڑھے لکھے لوگ ہیں، یونیورسٹی میں جب آپ پہنچتے ہیں تو یونیورسٹی سے بڑھ کر تو اَور کوئی ادارہ نہیں، اور یہاں یونیورسٹی کے فضلا ہوتے ہیں، گریجویٹس ہوتے ہیں، اُن سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی رہنمائی کریں، سوسائٹی کی قیادت کریں اور سوسائٹی کو اس گڑھے سے نکال کر آگے لے کر جائیں۔ وہ mob یا ہجوم کے پیچھے چلنے والے نہیں ہوتے۔ ہمارے ہاں موب چلتا ہے تو پھر لوگ اس کی قیادت سنبھال کر اور اُس ہجوم کو مزید مشتعل کر کے اپنی قیادت منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اصل میں ہمیں صاحبِ فکر لوگوں کی ضرورت ہے، جو معاشرے کے مسائل پر حقیقی طور پر غور وفکر کریں اور حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا سب سے بڑا حصہ (contribution) ہے کہ وہ ایک صاحبِ فکر شخصیت ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھ دیں اور کسی کتاب کا رُخ مشرق اور کسی کا مغرب ہو۔ لکھنے والے بہت ہوتے ہیں دنیا میں۔ آپ کو بہت سارے لوگ مل جائیں گے اور کتابیں ان کی بہت سی ہوں گی، لیکن ان کتابوں کا کوئی مرکزی نقطہ نہیں۔ جو کچھ معلومات جمع ہوئیں، وہ کتاب والے نے لکھ دیں۔ کچھ ادھر سے پڑھا، کچھ ادھر سے سنا تو وہ کتاب بن گئی۔ جب کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کے اندر آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط نظر آئے گا۔ ایک مربوط فکر ہے۔ اور اسی مربوط فکر کی اور اسی منہج کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکچرز کی اس سیریز کا اصل مقصد یہ تھا کہ جس عظیم شخصیت سے ہم سب واقف ہیں، نام ہم سب جانتے ہیں، ہمارے سلیبس میں بھی تذکرہ ہے، ہمارے مدارس میں بھی ذکر ہے، ہمارے مدارس کی جو اسناد ہیں، ان کے اندر ذکر ہے، دیوبندی مدارس میں ذکر ہے، بریلوی مدارس میں ذکر ہے، اہل حدیث مدارس میں ذکر ہے، غرض! تذکرہ بہت ہے، لیکن وہ شخصیت ہے کیا، اس کی فکر کیا ہے؟ اور اس فکر کی آج کیا اہمیت ہے اور اس کا کیا تقاضا ہے؟ یہ موضوع عام طور پر ہمارے ہاں بحث سے خارج ہے۔ اس وقت برصغیر میں جتنی بھی تحریکات، جو دین کے نام سے موجود ہیں، وہ سب کی سب اپنی نسبت امام شاہ ولی اللہ کی طرف کرتی ہیں۔ اب وہ کتنے فی صد درست ہے، وہ ایک علاحدہ موضوع ہے، لیکن اُن کی شخصیت کا ایک بہت گہرا اثر (impect) موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تأثر محض ایک عقیدت کے طور پر یا ایک ماضی کی

دیکھیں گے، تو پھر نتیجہ گروہیتوں کا نکلتا ہے، فرقوں کا نکلتا ہے، مسلکوں کا نکلتا ہے، اور آپ کو پتہ ہے کہ کوئی بھی فرقہ اور مسلک ہو اس وقت وہ بھی اندرونی طور پر متحد نہیں ہے۔ اُس کے اندر بھی آپ کو بہت ساری دراڑیں نظر آتی ہیں۔ جب ذہنیت ہی جھگڑے کی ہوگی، تنازعے کی ہوگی، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ہوگی اور اپنے آپ کو حرفِ آخر قرار دینے کی ہوگی تو تقسیم کا عمل کہیں نہیں رُکے گا۔ ہر فرقے کے اندر ذیلی فرقے نظر آئیں گے۔ پھر ان ذیلی فرقوں کے اندر مزید آپ کو تقسیم نظر آئے گی اور بات یہاں تک آجاتی ہے، جو مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کہی تھی کہ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کو حق سمجھتا ہے اور اپنے علاوہ سب کو باطل سمجھتا ہے کہ میں جو سوچ رہا ہوں، میں جو کہہ رہا ہوں اور میری جو بات ہے، یہ دین ہے، اور باقی سب مرتد ہیں۔

اس ماحول کے اندر ہمیں اور خاص طور پر جو پڑھے لکھے لوگ ہیں، یونیورسٹی میں جب آپ پہنچتے ہیں تو یونیورسٹی سے بڑھ کر تو اَور کوئی ادارہ نہیں، اور یہاں یونیورسٹی کے فضلا ہوتے ہیں، گریجویٹس ہوتے ہیں، اُن سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی رہنمائی کریں، سوسائٹی کی قیادت کریں اور سوسائٹی کو اس گڑھے سے نکال کر آگے لے کر جائیں۔ وہ mob یا ہجوم کے پیچھے چلنے والے نہیں ہوتے۔ ہمارے ہاں موب چلتا ہے تو پھر لوگ اس کی قیادت سنبھال کر اور اُس ہجوم کو مزید مشتعل کر کے اپنی قیادت منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اصل میں ہمیں صاحبِ فکر لوگوں کی ضرورت ہے، جو معاشرے کے مسائل پر حقیقی طور پر غور و فکر کریں اور حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا سب سے بڑا حصہ (contribution) ہے کہ وہ ایک صاحبِ فکر شخصیت ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھ دیں اور کسی کتاب کا رُخ مشرق اور کسی کا مغرب ہو۔ لکھنے والے بہت ہوتے ہیں دنیا میں۔ آپ کو بہت سارے لوگ مل جائیں گے اور کتابیں ان کی بہت سی ہوں گی، لیکن ان کتابوں کا کوئی مرکزی نقطہ نہیں۔ جو کچھ معلومات جمع ہوئیں، وہ کتاب والے نے لکھ دیں۔ کچھ ادھر سے پڑھا، کچھ ادھر سے سنا تو وہ کتاب بن گئی۔ جب کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کے اندر آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط نظر آئے گا۔ ایک مربوط فکر ہے۔ اور اسی مربوط فکر کی اور اسی منہج کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکچرز کی اس سیریز کا اصل مقصد یہ تھا کہ جس عظیم شخصیت سے ہم سب واقف ہیں، نام ہم سب جانتے ہیں، ہمارے سلیبس میں بھی تذکرہ ہے، ہمارے مدارس میں بھی ذکر ہے، ہمارے مدارس کی جو اسناد ہیں، ان کے اندر ذکر ہے، دیوبندی مدارس میں ذکر ہے، بریلوی مدارس میں ذکر ہے، اہلِ حدیث مدارس میں ذکر ہے، غرض! تذکرہ بہت ہے، لیکن وہ شخصیت ہے کیا، اس کی فکر کیا ہے؟ اور اس فکر کی آج کیا اہمیت ہے اور اس کا کیا تقاضا ہے؟ یہ موضوع عام طور پر ہمارے ہاں بحث سے خارج ہے۔ اس وقت برصغیر میں جتنی بھی تحریکات، جو دین کے نام سے موجود ہیں، وہ سب کی سب اپنی نسبت امام شاہ ولی اللہ کی طرف کرتی ہیں۔ اب وہ کتنے فی صد درست ہے، وہ ایک علاحدہ موضوع ہے، لیکن اُن کی شخصیت کا ایک بہت گہرا اثر (impect) موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تأثر محض ایک عقیدت کے طور پر یا ایک ماضی کی

بھی اس موضوع پر بات کی۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنے خطبات کا عنوان بھی یہ رکھا "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ"۔ اس کا مطلب یہ سوال سوسائٹی کے اندر موجود ہے۔

تشکیل جدید کے حوالے سے ہمیں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہاں پوری ایک فکر ملتی ہے۔ پورا ایک نظام ملتا ہے۔ اس وجہ سے اس سیریز کا مقصد ہمیں اس چیز کی طرف دعوتِ فکر دینا ہے کہ ہم اس موضوع پر سوچیں۔ اس موضوع پر ہمیں پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر تبادلہ خیالات کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں آج کے مسائل کا اُن سے ربط تلاش کرنا ہے۔ پھر اُس کے حل کی طرف بڑھنا ہے۔ ایک بہت بڑی علمی کاوش کی ضرورت ہے۔

جب تک علم نہیں ہوگا، فکر نہیں ہوگا، تحریک کچھ مفید نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں تحریک چلانے پر بہت زیادہ زور ہے۔ ایک تحریک چلتی ہے، پھر دوسری چل پڑتی ہے، پھر کسی اَور ٹائٹل سے چل پڑتی ہے، تو ہماری مثال ایک لطیفہ کی صورت بن جاتی ہے کہ 1948ء میں ہمارے ہاں سے کچھ مجاہدین گئے تھے کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے، تو ہمارے ایک مجاہد کے ہاتھ میں ایک ہندو بنیا آ گیا۔ اور اُس ہندو بنیے کی خوب پٹائی کی گئی۔ اور اُسے کہا گیا کہ کلمہ پڑھے تو پہلے تو وہ مزاحمت کرتا رہا۔ جب بہت زیادہ مار کھالی تو اُس نے ہمارے مجاہد بھائی سے، جو شمالی وزیرستان کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا، کہا جی پڑھائیں خان صاحب! کیا پڑھنا ہے؟ کہا: اوہو! وہ تو مجھے بھی نہیں پتہ، آؤ! مولانا صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھنا ہے۔ تو ہمارا حال بھی یہی ہے۔ اسلام، اسلام، اسلام، کوئی پوچھے بھئی کہ یہ ہے کیا؟ کہیں گے چلیں جی فلاں صاحب سے جا کر پوچھتے ہیں کہ وہ ہے کیا چیز؟ تو پھر وہ جو بتاتا ہے، وہ ایک فساد ہوتا ہے، یوں ایک شغل شروع ہو جاتا ہے۔ بہر حال ہمیں ان چیزوں پر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

ہم بہت ممنون ہیں کہ اپنے بڑے مصروف شیڈول میں سے حضرت مفتی صاحب نے وقت نکالا اور ہم نے اُن سے استفادہ کیا۔ آج چوتھا لیکچر ہے اور اس کا تعلق خاص طور پر سوسائٹی کی تشکیل سے ہے۔ شاہ صاحبؒ کا اپنا ایک خاص عنوان ہے "ارتفاقات" کا۔ اس کی وضاحت بھی ہوگی۔ اس کے مراحل کی بات بھی ہوگی اور سوسائٹی میں اس کے اطلاق کی بات بھی ہوگی۔ اور موضوع کی اہمیت کے حوالے سے یقیناً آپ مستفید بھی ہوں گے۔

ہم یہ چاہیں گے کہ آپ نے چار دن یہ ساری گفتگو سنی ہے، تو اپنے تأثرات سے ہمیں آگاہ کریں کہ آپ نے کیا محسوس کیا؟ آئندہ کے لیے اپنے ذہن میں اگر کوئی تجاویز ہیں، وہ دیں، ان شاء اللہ ہم اساتذہ موجود ہیں، شعبہ موجود ہے، تاکہ ان چیزوں کی روشنی میں جو آپ حضرات کی بہتری کے لیے ہوگا، ہماری بہتری کے لیے ہوگا، سوسائٹی کی بہتری کے لیے ہوگا، ہم اس کو مستقبل کے حوالے سے روبہ عمل لا سکیں۔ بہت شکریہ!

☆

چوتھا لیکچر

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریہ ارتفاقات

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم. اما بعد! فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ: قل یا ایھا النّاس إنّی رسول اللّٰہ إلیکم جمیعا. (القرآن) و قال النبیّ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم: "کانت بنو إسرائیل تسوسھم الأنبیاء، کلّما ھلک نبیّ خلفہٗ نبیّ آخر. ألا! لا نبیّ بعدی، سیکون بعدی خلفاء فیکثرون." و قال النّبیّ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم: "لا تزال طائفۃ من اُمّتی قائمین علیٰ الحقّ، لا یضرّھم من خالفھم." صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہٗ النّبیّ الکریم.

سماجی معاہدہ کی اہمیت

صاحبِ صدر اور معزز حاضرین، خواتین و حضرات!

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار و تعلیمات کے حوالے سے یہ چوتھا لیکچر سوسائٹی کی اجتماعی تشکیل کے حوالے سے ہے۔ پہلے روز کے لیکچر میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی سوسائٹی کا جو تحلیل و تجزیہ پیش کیا ہے، اس کے مطابق معاشرے میں فکری انتشار، سیاسی اضمحلال اور معاشی عدمِ اطمینان کی کیفیت تھی۔ گویا کہ سوسائٹی کی اجتماعی شیرازہ بندی دِگرگوں تھی۔ انتشارِ فکر، فرقہ واریت، گروہیت، طبقاتی نظام اور فرسودہ خیالات و تصورات کے سبب سوسائٹی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اب ایک ایسے معاشرے میں جہاں مختلف مذاہب، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف تہذیب و ثقافت سے وابستہ لوگ برعظیم پاک و ہند میں بستے ہیں، ان کے لیے ایک سماجی معاہدہ یا ان کی اجتماعی تشکیل کا ایک نیا قاعدہ اور ضابطہ یا سسٹم قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اُس دور کا تقاضا ہے۔ اس تقاضے کی تکمیل کے لیے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنا فلسفہ و فکر مرتب کیا۔

دوسرے لیکچر میں شاہ صاحبؒ کا جو فلسفہ و فکر ہے، اس کا ایک مربوط خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور اُس میں انسانوں کے اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کی ایک اہم ترین بحث مبحث الارتفاقات، کا بھی ذکر کیا گیا تھا کہ یہ ایک مستقل موضوع کا تقاضا کرتا ہے اور آج اسی عنوان پر ہم گفتگو کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس بحث میں شاہ

صاحبؒ نے اپنا فلسفہ اجتماع مرتب کیا ہے۔ اور اس کی اس حوالے سے بھی اہمیت ہے کہ شاہ صاحبؒ ہی کا ہم عصر روسو 1712ء میں پیدا ہوا اور 1778ء میں اُس کا انتقال ہوا۔ جب کہ شاہ صاحبؒ کی پیدائش 1703ء کی ہے اور 1762ء میں انتقال ہوا۔ یورپ کی سوسائٹی کا تحلیل و تجزیہ کر کے، وہاں کے مسائل کے تناظر میں ایک نئے معاہدۂ عمرانی (Social Contract) پر روسو نے 1762ء میں اپنی کتاب فرانسیسی زبان میں شائع کی۔ اور اُسی کے زیر اثر انقلابِ فرانس سے اجتماعی تشکیل کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، جو نہ صرف یورپین ممالک میں، بلکہ پھیلتا ہوا دنیا میں جن جن خطوں پر یورپ کا تسلط ہوا، آج بھی وہ اُن ممالک میں یا برطانیہ کے زیر انتداب رہنے والے ممالک میں دولتِ مشترکہ کے رُکن ملکوں میں اُسی طرح قائم ہے۔

شاہ صاحب کے فلسفہ اجتماع کا پس منظر

برعظیم پاک و ہند کے اس خطے کے اجتماعی تقاضے کیا تھے، بلکہ کل انسانیت کے اجتماعی تقاضے کیا ہیں؟ اور اُن کے لیے امام شاہ ولی اللہ نے جو فلسفہ اجتماع مرتب کیا، معاہدۂ عمرانی کی جو بنیادی تشکیل پیش کی، اُسے سمجھا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ شاہ صاحبؒ کی ان تعلیمات کی اساس، دین اسلام کی تعلیمات ہیں اور مغرب کی تعلیمات، اس کے فلسفہ و فکر کی اساس، جیسا کہ کل گفتگو میں عرض کیا گیا تھا، یورپ میں ابھرنے والے اُن فلسفیوں کے افکار رہے، جنھوں نے یورپ کی نشاتِ ثانیہ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ جن میں نظریۂ مادیت کہ مادی نقطہ نظر سے چیزوں کا مشاہدہ کرنا اور روح کا انکار کرنا اور نظریۂ ارتقا، انسان کو صرف سوشل اینیمل (Social Animal) قرار دے کر اور سماجی حیوان سمجھ کر اس کے حیوانی تقاضوں کی تکمیل کے امور متعین کرنا شامل ہیں، معاہدۂ عمرانی کے امور اسی حوالے سے ترتیب دیے گئے ہیں اور جو قوانین اور ضابطے حیوانی دور میں رہے Might is Right کہ طاقت ور ہی حکمران ہوتے ہیں۔ طاقت کی اساس پر ہی سیاسی نظام قائم ہوتے ہیں۔ جیسے جنگل میں جانور کی بادشاہت ہے تو وہاں کا بادشاہ درندہ طاقت کے بل بوتے پر حکمران ہے۔ یہی قانون اور ضابطہ حکمرانی یا حکمران طبقات کی تشکیل کے حوالے سے ہے۔ بہ ظاہر اُسے اجتماع کہا گیا یا ایک معاہدۂ عمرانی کہا گیا، لیکن وہ طبقاتی طاقت فیوڈل لارڈز سے نکل کر مرکنٹائل ازم چلانے والی بزنس کمیونٹی کے قبضے میں چلی گئی۔ یورپ میں ایڈم سمتھ کی 1776ء میں کتاب آتی ہے ''دولتِ اقوام''، مرکنٹائل دور کے جو بزنس مین ہیں، ان کی اساس پر طاقت فیوڈل لارڈز سے نکل کر زر پر کنٹرول رکھنے والی قوتوں کے قبضے میں چلی گئی۔ اور پھر جیسے ہی آگے سرمائے کی طاقت یعنی capital تخلیق پذیر ہوتا ہے تو یہ طاقت سرمایہ دار (capitalist) کے پاس چلی گئی۔

کہنے کو وہ بہ ظاہر ایک معاہدۂ عمرانی ہے، لیکن اس معاہدے کے دونوں فریق کے حقوق برابر نہیں ہیں۔ جمہوریت کا وہ نظام، جس میں سرمائے، جاگیر یا مذہبی پاپائیت کا جبر ہو، کہنے کو اُس کا نام جمہور ہے، لیکن سرمائے

کے جبر سے قائم ہونے والی سیاسی طاقت، اجتماعی شیرازہ بندی کا کردار کیسے ادا کرسکتی ہے؟ اگر آج دس سال پہلے ہارنے والے امریکی صدارتی اُمیدوار یہ کہے کہ چھ ملین ڈالر میرے پاس ہوتے تو میں امریکا کا صدر بن جاتا، اس کے یہ جملے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مغرب اور اس کا ہم نوا سیاسی نظام عام انسانوں کی جمہوری رائے کی اساس پر نہیں۔ بلکہ جاگیردا(Land Lord) یا حکمران طبقہ(Ruling Class) سے تعلق رکھنے والا فرد، اجتماعیت کے نام پر سیاسی اداروں کی تشکیل، معاشی اور سماجی اداروں کی تشکیل کر رہا ہے، جس کے نتیجے میں کیپٹل ازم، یعنی طبقات کے حامل امرا، لینڈ لارڈز، بزنس مین یا کیپٹلسٹ طاقت وقوت اور حکمران بن جاتے ہیں، حکمرانی کے تمام قاعدے اور ضابطے ان کے لیے کام کرتے ہیں، اور اگر اس کے ردعمل میں یورپ میں اسی فلسفہ اجتماع پر مارکس نے جدلیت کی اساس پر جو نظام تجویز کیا تھا، جس کو سوشلزم یا اشتراکیت کہا گیا تو وہاں بھی پرولتاریہ کے نام پر آمریت تھی اور پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ تھی، گویا عام انسانوں کے انسانی حقوق یا جمیع جمہور کے حقوق اور مفادات کا عمرانی معاہدہ ہے ہی نہیں، بلکہ امیر طبقات کی آمریت ہے یا ایک مخصوص پارٹی کی طبقاتی آمریت ہے۔

اب اس تناظر میں یہ جو دو ڈھائی سو سالہ دور ہے، اس میں فلسفہ اجتماع یا تشکیل نو، یورپ کے نقطہ نظر سے زیر بحث رہا، ایشیا اور افریقا کے عوام یا انسانوں کے نقطہ نظر سے وہ فلسفہ اجتماع تشکیل نہیں دیا گیا اور چوں کہ پورا ایشیا وافریقا یورپ کا غلام رہا ہے تو غلام اپنا نظام اپنے آزادانہ رائے سے قائم نہیں کرسکتا خواہ وہ علم وفکر کے نام پر ہو، سیاست ومعیشت کے نام پر ہو۔ ایشیا اور افریقا کے ممالک میں اسی عمرانی فلسفے کو مسلط کر دیا گیا، عملاً بھی اور علماً بھی۔ تعلیمی ادارے بھی، تعلیم وتربیت بھی اسی نہج پر اور عملی ڈھانچہ بھی اس نہج پر قائم کیا گیا۔

اب ایسے ماحول میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین اسلام کی تعلیمات اجتماعی نقطہ نظر سے کوئی فلسفہ اجتماعیت یا کل انسانیت کی فلاح و بہبود کا کوئی طریقۂ کار متعین کرتی ہیں؟ باقی مذاہب تو تابع(surrender) ہو چکے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت، ہندومت، بدھ مت، کنفوشس اِزم وغیرہ نے کہہ دیا کہ عبادت ہماری اور سیاست ومعیشت مغرب کی، گویا سمجھوتہ(compromise) کر لیا لیکن کیا مسلمان ایسا کرسکتا ہے؟، جن کا دعویٰ ہے اور جو اس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ قیامت تک کے لیے مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ کی تعلیمات کل انسانیت کے لیے ہیں۔ قرآن نے نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالی نے مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے:

قل یا ایها الناس إنی رسول الله الیکم جمیعا.

(اے محمد! ﷺ کہہ دیجیے۔ میں تم تمام کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں)

اور یہ رسالت قیامت تک کے لیے ہے۔ آپ ﷺ آخری نبی ہیں، ان کے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے۔ پھر مسلمانوں کا سیاسی نظام یا اجتماعیت گیارہ بارہ سو سال تک دنیا میں قائم بھی رہی۔

اس تناظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کل انسانیت کی فلاح و بہبود کا فلسفہ اجتماع کیا ہے؟ امام شاہ ولی اللہ

دہلویؒ نے اس فلسفہ اجتماع یا سوسائٹی کے ان معاہدات کی اساسیات واضح کی ہیں۔ سوسائٹی بنتی ہے سماجی معاہدات کے مجموعے سے۔ فرد دوسرے فرد کے ساتھ قدم قدم پر معاہدے میں بندھا ہوا ہے۔ معاہدے کے بغیر زندگی کا کوئی پہلو نہیں۔ میاں بیوی کے معاہدۂ نکاح، خریدار اور فروخت کنندہ کے معاہدے، شہری سطح پر مختلف مارکیٹوں میں کام کرنے والے لوگوں کے درمیان معاہدات، صوبے اور ریاست میں حکومت اور عوام کے درمیان معاہدات، ایک مملکت کے اندر قوم کی تشکیل کے معاہدات، آئینی اور قانونی معاہدات اور ممالک اور اقوام کے درمیان بین الاقوامی معاہدات وغیرہ۔ ان معاہدات کے مجموعے کا نام سماج اور سوسائٹی ہے۔ سوشیالوجی اس سے بحث کرتی ہے اور فلسفہ اجتماعیت اس کو ہدف بنا کر کام کرتا ہے لہٰذا دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں کل انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے فلسفہ اجتماعیت کیا ہوگا؟

ارتفاقات کا مفہوم

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے نظریۂ ارتفاقات میں فلسفۂ اجتماعیت کی وضاحت کی ہے۔ اور اس کے مراحل بیان کیے ہیں۔ ارتفاق کا لفظ بھی شاہ صاحبؒ کا اپنا خود ساختہ نہیں ہے۔ یہ قرآن کا استعمال کردہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے جہاں انعامات یا اچھی سوسائٹی کا تذکرہ آیا ہے، یا جنت میں اچھے حالات کا تذکرہ آیا ہے، تو وہاں لفظ استعمال کیا گیا حسنت مرتفقا اور جہاں بُرے نتائج کا تذکرہ ہے، وہاں ساء ت مرتفقا۔ ذکر کیا گیا۔

ارتفاق کا مادہ رِفق سے ہے، یعنی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرنا۔ انسانی سوسائٹی کے تمام سماجی معاہدات اور تمام سطحوں میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانا اور آسانیاں پیدا کرنا، خواہ یہ آسانیاں علمی سطح پر ہوں یا عملی حوالے سے۔ ارتفاقاتِ عقلیہ اور ارتفاقاتِ معاشیہ، یعنی عقلی مسائل عقلی عقدے (cruxes) حل کرنے کے لیے جو قوانین اور ضابطے دریافت کیے جاتے ہیں، وہ عقل کے استعمال کی سہولتیں پیدا کرتے ہیں مثلاً ضرب، جمع تقسیم وغیرہ کے لئے کلکولیٹر کی ایجاد جیسی جتنی بھی دریافتیں آئی ہیں، یہ انسان کی ذہنی استعداد ہے۔ اسی طرح آج کمپیوٹر کا وجود میں آنا ہے۔ یہ وہ ارتفاقات یا سہولتوں کا نظام ہے، جس سے دماغی کام میں سہولت پیدا ہوتی ہے اور اس کے عقلی مسائل حل ہوتے ہیں۔ عقلی مشکلات کے حل کرنے کا جو صحیح طریق کار (method) ہے، وہ ارتفاقاتِ عقلیہ کہلاتا ہے۔ انسان کی دو بنیادی خصوصیات امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بیان فرمائی ہیں کہ انسان حیوانیت سے جب ممتاز ہوتا ہے تو ایک تو اُس میں زیادۃ القوۃ العقلیہ، یعنی اس کی قوتِ عقلیہ زیادہ اور بہتر ہوتی ہے۔ اور دوسرا براعۃ القوۃ العملیہ یعنی قوتِ عملیہ کی مہارت اور صلاحیت، تو قوتِ عقلیہ کے لیے سہولتوں کا جو نظام بنایا جاتا ہے، اُسے ارتفاقاتِ عقلیہ کہا جاتا ہے کہ عقل کو کام کرنے میں آسانی رہے کہ اس کو اگر کوئی مشکل درپیش ہو رہی ہے، تو اس کو حل کرنے کا طریقہ اس کے سامنے آجائے، جب کہ عملی مسائل کے حل کرنے کے لیے ارتفاقاتِ معاشیہ یا سوسائٹی کے

سماجی معاہدات کے تمام سہولتوں کا نظام کام کرتا ہے۔

ارتفاق اول کی سطح

جب ہم اجتماعیت پر بحث کریں گے تو اس اجتماعیت کی چار بنیادی سطحیں ہیں، جسے شاہ صاحبؒ نے کہا ارتفاقِ اوّل، دوم، سوم اور چہارم۔ ارتفاقِ اوّل میں یا ابتدائی ارتفاق میں دوسرے انسانوں سے ہمارا جو اجتماعی ربط (interaction) ہوتا ہے، اس کے کل گیارہ بنیادی امور شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ میں متعین کیے ہیں، ان میں سے سب سے پہلا اجتماعیت کا پہلو انسانیت کی سطح پر زندگی کے آتے ہی، زبان ہے، جس سے اظہار مافی الضمیر کرتا ہے۔ دوسرے کے ساتھ اس کا انٹریکشن زبان سے ہوتا ہے۔ ورنہ خود کو مثلاً پیاس لگی ہے، اٹھ کر پانی پی لے، اسے بولنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کھانے کے لیے خود کوئی کام شروع کر دے اور اظہار مافی الضمیر کی ضرورت نہیں۔ انسان بولتا تبھی ہے، جب وہ کسی دوسرے انسان کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے کہ جو کیفیت، حالت، یا جس چیز کو وہ دوسرے سے شیئر (share) کرنا چاہتا ہے، اُسے وہ بیان کرے۔ ارتفاقِ اوّل کی پہلی بنیادی چیز لغت اور زبان ہے۔ اور پھر اس لغت پر بھی شاہ صاحبؒ نے تفہیماتِ الٰہیہ میں بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔

آج ماہرین لسانیات اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ کس اساس پر زبان بنی؟ حلق کے نیچے سے یعنی اقصائے حلق سے لے کر ان ہونٹوں تک حروفِ تہجی کی تقسیم اور ترتیب کیوں کر وجود میں آئی؟ انسان کے ضمیر میں محفوظ معانی کو زبان دینے اور ان کے اظہار کرنے کے لیے کون کون سے طریقے اور ٹیکنیکس استعمال کیں۔ لسانیات کے ارتقا کی پوری تاریخ اس لفظِ لغت کے اندر محفوظ ہے خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو۔ اس کے علاوہ انسان میں کھانے، پینے، پہننے، گرمی سردی سے بچاؤ اور نسل کی بڑھوتری کے لیے امور ہیں، کاشت کاری ہے، صنعت ہے، تجارت ہے، قانون اور رسم و رواج کی ضرورت ہے، جس کے تحت افراد کے درمیان اختلافی مسائل کو حل کرنے کی سوچ موجود ہے۔ آلات اور اوزار ہیں، جن کو وہ اپنی ان تمام ضروریات کی کفالت کے لیے استعمال میں لاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ الغرض گیارہ کے قریب بنیادی امور، جن کا تعلق اُس کی سماجی سرگرمیوں سے ہے۔

قرآن حکیم نے کہا: ''علّم آدم الاسماء کلّها.'' (اللہ نے آدم کو تمام اسماء سکھائے)

صاحبِ جلالین نے وہاں حتی القصعة و القصیعة کا لفظ استعمال کیا ہے کہ پانی پینے کا پیالہ، برتن کے استعمال کے طریقے وغیرہ وغیرہ تک اسماء میں شامل ہیں۔ یعنی جو امور و آلات اُس کی اجتماعیت کی تشکیل کے لیے ضروری تھے، وہ سکھائے گئے، جن کو اس نے استعمال میں لا کر سوسائٹی کی ترقی کے لیے کردار ادا کیا۔ سب سے پہلے وہ بنیادی اساسی امور ہیں، جو انسانیت سے وابستہ ہیں۔ اور اُس سے متعلقہ جتنے اوزار یا اشیاء وجود میں آئیں، یہ تمام چیزیں، ان کا تعلق اجتماع سے ہے۔ یہ ارتفاقِ اوّل ہے۔ جس کے بنیادی امور کو ارتقا کے مختلف مراحل سے گزارا گیا یا گزرے۔

نوعِ انسانی کی بنیادی خصوصیات

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ جب ان اجتماعی معاملات میں، ارتفاقات میں انسان منہمک ہوتا ہے تو انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے والے بنیادی امور تین ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ انسانی سطح پر رفاہِ عامہ کا تصور پایا جاتا ہے، یعنی الرأی الکلی یا اجتماعی مفاد کے لیے کام کرنا خواہ وہ گھر کے تمام افراد کے لیے ہو، سوسائٹی میں مارکیٹ کے لوگوں کے لیے ہو، ملکی سطح کے افرادی اجتماعیت کے لیے ہو، قومی سطح کے تناظر میں ہو، یا بین الاقوامی سطح کے تعلقات کے حوالے سے ہو۔ اجتماعی مفادِ عامہ اور الرأی الکلی کی ضد الرأی الجزئی ہے کہ انسان کام کرے ذاتی مفاد کے لیے۔ یہ انسانیت نہیں ہے، یہ حیوانیت ہے۔ حیوان ہمیشہ کام کرتا ہے صرف اور صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے۔ اس میں اجتماعیت کا وہ درجہ نہیں پایا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی سہولت، دوسروں کے فائدے، اُن کے مفاد کے لیے کسی قسم کا کوئی کام کرے۔ نہ اُس کی ایسی استطاعت ہے، نہ اُسے ضرورت ہے۔ انسان میں جیسے ہی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، تو اس میں مفادِ عامہ، اجتماعی فلاح و بہبود، اجتماعی تصور کے تحت سوسائٹی کی تشکیل دینے کا عمل پایا جاتا ہے۔

دوسری اہم ترین خصوصیت، جو جانوروں میں نہیں ہے، انسانی سطح پر پائی جاتی ہے، وہ ایجاد و تقلید کا مادہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے اور نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں تو وہ نئی نئی ایجادات وجود میں لاتا ہے، نئی دریافتیں سامنے آتی ہیں، تخلیقات کرتا ہے، اجتماعی غور و فکر کے نتیجے میں نئی سے نئی ایجادات اور نئی سے نئی ٹیکنالوجی سامنے آتی ہے۔ تو انسان کی اجتماعیت کا دوسرا اہم ترین دائرہ ایجادات کی تخلیق ہے اور پیدا شدہ یا دریافت شدہ ایجادات کی تقلید اور اتباع ہے۔ جب بھی کوئی نئی چیز، نئی ٹیکنالوجی سامنے آتی ہے اور لوگوں کو اُس سے کچھ سہولت ملتی ہے تو لوگ اس کی تقلید کرتے ہیں مثلاً فوراً اُسے خرید لیتے ہیں جیسے آج سے تیس چالیس سال پہلے موبائل فون کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انسانی سہولت کی یہ چیز آئی تو لوگوں نے دھڑا دھڑ خریدی اور ہر آدمی آج یہ موبائل لیے پھرتا ہے۔ تو ایجاد و تقلید کا مادہ اس میں پایا جاتا ہے۔

تیسری بڑی خصوصیت جو شاہ صاحب واضح کرتے ہیں، اجتماعیت کے ارتقا اور ترقی میں وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس میں حُبِّ جمال ہے۔ ضرورت تو ایک ناقص ادھوری چیز سے بھی پوری ہو سکتی ہے لیکن وہ اس میں خوب صورتی چاہتا ہے، نزاکت چاہتا ہے، شفافیت چاہتا ہے، حسن چاہتا ہے، جمال کا گرویدہ ہے۔ اچھا مکان، اچھا لباس، اچھی چیزیں۔ اور پھر اُن کے لیے چیزوں کو ایجاد کرتا ہے اور پھر اُن کی تقلید کرتا ہے۔ یہ اجتماعی رویہ ہے۔

ارتفاقِ ثانی کا مرحلہ

پہلے مرحلے میں جو بنیادی اجتماعی امور ہیں، ان کو جب دوسری سطح پر جا کر اگلے مرحلے میں ان تینوں اصولوں کے تناظر میں پرکھا گیا تو اس سے اگلا مرحلہ وجود میں آتا ہے، جسے شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں ارتفاقِ ثانی

کہا جاتا ہے۔ اجتماعی مفادِ عامہ کے تناظر میں چیزوں کا جائزہ لینا اور اس نقطہ نظر سے جو چیز قرار واقعی یا کمزور اور ناقص ہے یا رائی جزئی کی بنیاد تھی، اس کو چھوڑ دینا، نئی ایجاد کے تناظر میں پُرانی ایجادات یا پُرانی چیزوں کی تقلید چھوڑ دینا، فرسودہ طریقوں کو پس پشت ڈال دینا، خوب صورتی اور جمال کے تحت جب تجزیہ کیا تو بدصورت چیز کو چھوڑ کر اگلی چیز کی طرف چلے جانا۔ اور اس ارتفاقِ ثانی کی سطح پر افراد کی یہ جماعتی زندگی مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اور اسی مرحلے پر جتنے امور ہوتے ہیں، اُن کا تعلق حکمت سے ہوتا ہے۔ حکمت کی تعریف شاہ صاحبؒ نے کی کہ جہاں عقل کا استعمال ہو اور اجتماعی مفاد پیش نظر ہو اور اس تناظر میں چیزوں کو پرکھنا اور اُن کا ٹھیک استعمال کرنا۔ اس لیے عربی میں اس کی تعریف کی جاتی ہے کہ:

معرفة الحقائق کما ھی و وضعھا علیٰ محلّھا علی الصواب.

کہ گرد و پیش کی اشیا کو، چیزوں کو، ماحول کو، حقائق کے تناظر میں پرکھنا، معرفت حاصل کرنا اور اس طرح علم حاصل کرنا کہ واقعی جیسا کہ ہیں، محض عقیدت کے تصورات کے تناظر میں نہیں بلکہ حقائق کے تناظر میں چیزوں کا جائزہ لینا اور دستیاب شدہ اشیا یا ماحول کے تناظر میں ان چیزوں کو ایک ایسے طریقے سے درست طور پر استعمال میں لانا کہ وہ انسانیت کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور اجتماعی مفاد کے لیے زیادہ بہتر ہوں۔

اس کے نتیجے میں شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ انھی امور کو جب نکھارا گیا ہے تو معاشیات کے شعبے وجود میں آئے۔ (جن کی تفصیلات کل بیان کی گئی تھیں۔) دولت کے پیدائش کے پیشے وجود میں آئے۔ دولت کی تقسیم، دولت کی تجارت، وسائل کی تجارت، اور اُس کے استعمالات سے متعلق اُمور رفاہی شکل میں اگلے مرحلے میں داخل ہوئے۔ گھریلو نظام جو ارتفاقِ اوّل میں محض میاں بیوی کے معاہدے تک محدود ہے، وہ مزید بہتر بنا۔ اولاد کے کیا حقوق ہیں ماں باپ پر؟ ماں باپ کے کیا حقوق ہیں اولاد پر؟ گھر چلانے کے لیے، نظم و نسق چلانے کے لیے اس کی معاونت اور تعاون کرنے والے افراد کے کیا حقوق ہیں؟ معاشی وسائل ایک خاندان کیسے حاصل کرے گا؟ ان دستیاب معاشی وسائل کو وہ خاندان کے فائدے کے لیے کیسے استعمال میں لائے گا؟ تو یہ اجتماعی تقاضے نئی شکل میں ابھرے، جن کے لیے شاہ صاحبؒ نے لفظ استعمال کیا ہے "تدبیر المنزل"، یعنی گھریلو نظام، یا ایک خاندان یا قبیلے کا نظام تشکیل دینا اور اُس کی تمام ضروریات کی کفالت کے لیے اس سطح کی اجتماعیت کو ترقی دینا۔

ارتفاقِ ثانی میں صرف خاندانی نظام ہی نہیں بلکہ اس مرحلے پر معاشی ذیلی شعبوں کی جماعتیں وجود میں آئیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ تمام انسان اپنی تمام ضرورتیں از خود پوری نہیں کر سکتے، انھیں دوسرے انسانوں سے تعاون کی ضرورت ہے تو اب اس مرحلے پر آ کر انسانوں نے پیشے متعین کر لیے تاکہ زیادہ مہارت، زیادہ جمالی حس، مفادِ عامہ کے لیے زیادہ بہتر کام، زیادہ اچھے طریقے سے ایجادات اور تقلید کا عمل وجود میں آئے تاکہ ذہن ایک ہی کام پر مرتکز (focus) ہو جائے مثلاً کپڑا بُننے والے الگ بن گئے، زراعت اور کاشت کاری کرنے والے لوگوں کی الگ

سے جماعت وجود میں آ گئی، تاجروں کی الگ سے جماعت وجود میں آ گئی جو تجارت کے شعبے کو نکھارتے ہیں، دست کاری اور صنعت سے متعلق جو امور تھے ان میں بھی الگ الگ تقسیم شروع ہو گئی کہ کوئی لباس بنائے گا، کوئی جوتا بنائے گا، کوئی فرنیچر بنائے گا وغیرہ وغیرہ۔ کیوں کہ جب آدمی اپنی پوری توجہات ایک ہی علم وفن یا ہنر پر فوکس کر لیتا ہے تو نکھار پیدا ہوتا ہے۔ نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایجاد وتقلید کا بنیادی جذبہ آگے بڑھتا ہے۔ مفادِ عامہ کی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ جمالی حس ترقی کرتی ہے۔

ارتفاق ثالث یا قومی نظام

اب ان جماعتوں میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ معاملات کے فہم کا طریقۂ کار، ایک دوسرے کے ساتھ ان کے تعلقات و معاہدات وجود میں آئے۔ اب ان امور کو انجام دیتے ہوئے یقیناً اختلافات بھی ہو سکتے ہیں۔ معاشرے کی اجتماعیت میں جو دراصل صحیح اسلوب پر قائم ہے، کچھ انفرادیت پسند طبیعتوں سے اس میں جھگڑے پیدا کرنے کا امکان ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اگر کسی سوسائٹی میں، کسی شہر میں مثلاً دس ہزار کے قریب آبادی ہو جائے اور مختلف جماعتیں وجود میں آ جائیں تو وہاں لازمی ایک نظمِ مملکت قائم کرنے کی، نظمِ حکومت قائم کرنے کی اور ایک معاہدۂ عمرانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سیاسی ڈسپلن قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان جماعتوں پر اگلے مرحلے میں ایک ریاست کا وجود ہوگا اور جب ریاست کا وجود ہوگا تو ایک اتھارٹی بنانی پڑے گی۔ قومی نظام بنانا ہوگا۔ اس قومی نظام کے تحت جماعتوں میں پیدا ہونے والے اختلافات کو ختم کرنا ہوگا۔ اور اُن تمام معاشی سماجی امور کی انجام دہی کو حکومتی اتھارٹی کے ذریعے سے تحفظ فراہم کرنا ہوگا تاجروں کو، کاشت کاروں کو، صنعت کاروں کو اور دیگر امور سرانجام دینے والوں کو، غرض معاشرہ کے تمام افراد کو جان مال عزت آبرو کے تحفظ کے لیے ایک قومی سیاسی نظام کی ضرورت پیش آئے گی اور یہیں سے ارتفاقِ ثالث یا قومی نظامِ حکومت کا ایک ڈھانچہ سامنے آتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ اس ارتفاقِ ثالث کی بنیادی ضرورت ایک سیاسی نظام ہے۔ سیاسی نظام کیا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے کہا سیاسی نظام دراصل وہ ربط (connection) جو تمام جماعتوں کے درمیان موجود ہے، اجتماع یا ایک شہر یا ریاست کے اندر جو افراد رہتے ہیں یا وہ مختلف گھروں میں رہتے ہیں یا مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں، ان کے درمیان یہ جو ربط ہے، اس کو زیادہ سے زیادہ بہتر طور پر سرانجام دینے اور اس کو مربوط طور پر آگے بڑھانے کے لیے سیاسی نظام کی ضرورت ہے۔ الحکمة السياسية کی تعریف شاہ صاحبؒ نے یہی کی ہے کہ

"حفظ الربط الواقع بين اهل الاجتماعات و يكونون اهل منازل شتى."

یعنی جو چند مختلف خاندانوں پر مشتمل لوگ ہیں، مختلف جماعتیں ہیں، ان کے درمیان جو اُس سوسائٹی کے تقاضوں کے اعتبار سے ایک اَن دیکھا ربط ہے، اس ربط کو محفوظ کرنا۔

اسی طرح شاہ صاحبؒ نے شہر کی تعریف بھی کی کہ میرے نزدیک مدینہ یا شہر سڑکوں، عمارتوں یا بلڈنگوں کا نام نہیں ہے، بازاروں کا نام نہیں ہے بلکہ انسانوں کے جو انسانی رشتے ہیں، باہمی احترامات (considerations) ہیں، ان کی اجتماعیت، میرے نزدیک وہ مدینہ ہے۔ مدینہ منورہ کا عنوان بھی مدنیت سے ہے، تمدن سے ہے۔ یثرب کو مدینہ اسی لیے کہا گیا کہ حضور ﷺ کی آمد سے پہلے وہاں کوئی سول سوسائٹی نہیں تھی۔ کوئی اجتماعی مربوط نظام، کوئی تہذیب وتمدن کی شکل موجود نہیں تھی۔ حضور ﷺ نے آ کر اُسے ایک تہذیب دی، ایک ریاست تشکیل دی اور ایک سیاسی نظام بنایا۔ اس لیے وہ یثرب جو مختلف قبائل اور علاقوں میں منقسم مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں، یہودیوں اور اوس وخزرج کے قبائل اور خود یہودیوں کے پندرہ بیس قبائل پر مشتمل تھا، اس کو ایک یونٹی (unity) دی، ایک وحدت دی، اس لیے اس کو مدینہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کے زمانے کے لحاظ سے ''مصر'' کا لفظ کہا گیا۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

''وجاء بكم من البدو من بعد ان نزغ الشيطان بيني و بين اخوتي.''

کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین اور بھائیوں سے کہا کہ اللہ تم لوگوں کو دیہات سے یہاں مصر لایا تو مصریت بھی تمدن، تہذیب، ثقافت اور سویلائزیشن (civilization) کہلاتی ہے۔

قومی ریاست کی عصری تشکیل کے تقاضے

شاہ صاحبؒ نے چھ بنیادی اساسی امور واضح کر دیے کہ قومی ریاست کی تشکیل میں کن کن امور کو پیش نظر رکھا جائے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا: معاہدہ کرتے وقت سب سے پہلے تو ایک آئینی اور قانونی نظام کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں البدور البازغہ میں کہ:

''لا بدلهم من سنة عادلة مسلمة عند جماهيرهم.''

اُس ریاست میں بسنے والے جمہور لوگوں کے اتفاق سے بننے والی سنتِ عادلہ یعنی عدل وانصاف پر مبنی طریقۂ کار اور قانون وجود میں آنا چاہیے۔ کوئی طبقہ، کوئی گروہ، کوئی جماعت اپنی گروہی طاقت کے بل بوتے پر اپنا خود ساختہ کوئی آئین اس پر مسلط نہیں کر سکتی۔ جمہور کی رائے سے قانون وجود میں آئے گا۔ کوئی بزنس کمیونٹی اپنے مفاد کے لیے آئین اور قانون بنائے۔ کوئی لینڈ لارڈ اپنے مفادات کا آئین اور قانون مسلط کر کے کہے کہ یہ قانون کی حکمرانی (Rule of Law) ہے، یہ درست نہیں۔ لہٰذا پہلے قانون معلوم ہونا چاہیے، جس کی حکمرانی قائم کرنی ہے۔ قانون اگر جاگیرداری کے مفاد کا ہے اور سرمایہ دار کے مفاد کا ہے تو پہلے تو قانون کو چیلنج کیا جائے گا کہ یہ قانون کیا جمہور کے مفاد کا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے دوٹوک ضابطہ بنا دیا، واضح کر دیا کہ کسی بھی قومی جمہوری ریاست کے لیے ضروری ہے کہ جمہور کے مفادات یا جمہور کے تسلیم شدہ (مسلّمة عند جماهيرهم) اساس پر قانون بنے گا۔

اور جو قانون جمہور کے ہاں متفق علیہ ہے، اسی قانون کی روشنی میں عدلیہ وجود میں آئے گی۔ عدلیہ کا بنیادی کام اُس طے شدہ قانون کی روشنی میں ان امور پر عمل درآمد کا جائزہ لینا ہے، جو سوسائٹی میں سرانجام پا رہے ہیں، خواہ جماعتوں کے درمیان ہوں یا حکمران اور عوام کے درمیان۔ اسی قانون اور طریقۂ کار کے مطابق تیسری چیز جو شاہ صاحبؒ نے اپنے فلسفہ ارتفاقات یا اجتماع میں بیان کی، وہ انتظامیہ ہے، جو نظم و نسق قائم کرے گی، اس اتھارٹی کا معیاری ضابطہ (criteria) بھی متعین ہے کہ جتنے بھی سوسائٹی کے اندر جماعتیں اور گروہ موجود ہیں، افراد موجود ہیں، خاندان موجود ہیں اور جماعتیں موجود ہیں، ان کے تناسب سے، ان کے نمائندے منتخب کیے جائیں۔ ان کو شاہ صاحبؒ نے ''نقباء'' کہا ہے۔ اُن جماہیر کی رائے لینے والے یہ افراد سوسائٹی میں کس کردار کے اور کس شرط کے ہوں، کیا اُن کے معیارات ہونے چاہئیں؟ وہ بھی متعین ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ ہر نقیب یا منتخب نمائندے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اسی قوم میں سے ہو۔ اس کے علاوہ نہیں۔

شاہ صاحبؒ نے حکومتی ڈھانچے کی تشکیل کے حوالے سے ایک بڑی اہم بات 1735ء میں حجۃ اللہ البالغہ میں لکھی ہے اور اُسی زمانے میں البدور البازغہ لکھی ہے۔ روسو کا معاہدۂ عمرانی (Social Contract) تو 1762ء میں آیا ہے اور انقلابِ فرانس تو اس کے ساٹھ سال بعد آیا ہے۔ شاہ صاحبؒ اُس زمانے میں کہتے ہیں کہ

''ليس الإمام عندنا هو الفرد الواحد الانساني.''

ہمارے نزدیک حکمران صرف ایک فردِ واحد کی آمریت یا شخصی حکومت کی بنیاد پر نہیں ہے اور مزید اس دور کے تقاضوں کے تناظر میں شاہ صاحبؒ نے بڑی اہم بات کہی کہ ہمارے نقطۂ نظر سے ریاست کی تشکیل خاص طور پر اُن معاشروں میں، جہاں نقائص اور کمزوریاں موجود ہیں:

''اجتماع عقلاء القوم و مبرزيهم.''

کی اساس پر ہوگی یعنی قوم کے عقل منداور منتخب لوگوں کا اجتماع یا پارلیمنٹ فیصلہ کرے گی۔ اس کے مطابق نظم مملکت چلایا جائے گا۔

واضح ہو کہ 1735ء میں جب ابھی یورپ کے ہاں جمہوریت کا کوئی تصور نہیں تھا، شاہ صاحبؒ یہ بات کہہ رہے ہیں، جو تین امور پر مشتمل ہے۔ ایک تو منتخب نمائندہ، جس کی اجتماعیت قائم کرنی ہے، وہ اس قوم میں سے ہو۔ مولانا سندھیؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو آدمی قوم میں سے نہیں ہوتا، وہ قوم کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ دوسری قوم کا فرد آپ کی مشکلات اور مسائل کی نمائندگی کیسے کرسکتا ہے؟ قوم میں سے ہونا ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ سمجھدار اور عقل مند ہو۔ اور تیسرا یہ کہ مبرز یعنی منتخب ہو، وہ جو میدان میں تجربے، اپنے کردار، اپنے اعمال، اپنی عقلی، اپنی علمی و عملی خدمات کے تناظر میں یہ ثابت کر چکا ہو کہ وہ اس قوم کی نمائندگی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ گویا جاہل، بے وقوف، احمق، لاپرواہ انسان، ذاتی مفادات پر کام کرنے والا اور اجتماعیت کے لیے کوئی

خدمت سرانجام نہ دینے والا آدمی، منتخب نمائندہ نہیں ہوسکتا اور ایسا فرد آگے نہیں آسکتا کیوں کہ خود وہ اپنی انفرادی سطح میں قوم کے لیے کوئی خدمات نہیں ادا کرسکتا تو اُس کی نمائندگی کیسے کرے گا؟

اور پھر جتنی جماعتیں اس سوسائٹی میں موجود ہوں، ان میں سے ان کا نمائندہ ہونا ضروری ہے۔ کسان ہیں، مزدور ہیں، زمین رکھنے والے ہیں، صنعت کار ہیں، تجارت والے ہیں، یعنی جن کی جماعت وجود میں آگئی ہو، جو قوم اپنی کمیونٹی اور اجتماعیت کی بنیاد پر ہے، ان میں سے نمائندہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ غریب عوام کا نمائندہ سرمایہ دار ہے، تاجر ہے، جس نے اپنا مال بیچنا ہے۔ یہ نہیں کہ مزدور اور کسان کا نمائندہ لینڈ لارڈ اور فیوڈل لارڈ ہو جو اپنے مفادات کے لیے نمائندگی کرتا ہے۔ بلکہ سوسائٹی میں جتنی موجود جماعتیں ہیں، ان کی نمائندگی اسی تناسب سے اس اجتماع کے اندر ہوگی۔

قومی قیادت کی نوعیت

ظاہر ہے کہ ہر اجتماع کا ایک سربراہ ضروری ہے۔ شاہ صاحبؒ کا جملہ ہے کہ: ''**لا بدّ لکلّ نظام من سائس**۔''

کہ ہر نظام کا ایک رہنما اور لیڈر رہتا ہے۔ اس کو سائس و منتظم چاہیے، فیصلہ کرنے والا ہونا چاہیے، جو اجتماعی فیصلوں کو اجتماعی شکل دے کہ وہ انتظامی نظم و نسق قائم کرنے کا سربراہ ہے۔

قرآن حکیم نے قیادت کی خصوصیات بھی بیان کیں: ''**بسطة فی العلم و الجسم**۔''

اس تناظر میں علم بھی اعلیٰ درجے کا ہو، وہ دنیا کے تمام سیاسی، سماجی، معاشی، عمرانی، تمام معاملات کا فہم رکھتا ہو، اس کا علم وسیع ہو اور وہ باقی تمام لوگوں سے علم میں، تجربے میں، مشاہدے میں سب سے بہتر ہو۔ شاہ صاحبؒ نے کہا: وہ آزاد ہو، کسی دوسرے کی ڈکٹیشن قبول کرنے والا نہ ہو، دوسرے ملکوں یا دوسرے حکمرانوں کی ڈکٹیشن کی اساس پر اس کے فیصلے نہ ہوں بلکہ آزادیٔ رائے، حریت کے ساتھ فیصلہ کرے۔ بہادر اور دلیر ہو یعنی شجاعت ہو اعلیٰ درجے کی اور بزدل نہ ہو۔ بزدل کے حوالے سے ایک دلچسپ جملہ شاہ صاحبؒ نے استعمال کیا ہے: ''**کادت الشاۃ تبول علیه**۔'' (بکری بھی اس پر پیشاب کر جائے گی) گویا بزدل آدمی کی کیا حیثیت؟ وہ حکمرانی کے لائق کیسے ہوسکتا ہے؟

شاہ صاحبؒ نے خصوصیت کے ساتھ البدور البازغہ میں تذکرہ کیا ہے کہ اَخلاقِ فاضلہ اس ملک کے سربراہِ مملکت کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔ اسی طرح انتظامیہ کا سربراہ، اجتماع اور اس پارلیمنٹ کا سربراہ، اس کے وزراء عمدہ اَخلاق رکھتے ہوں۔ اور پھر شاہ صاحبؒ نے لازمی قرار دیا ہے کہ عدلیہ، انتظامیہ اور آئین و قانون کے تین دائروں کے بعد اگلے مرحلے میں سوسائٹی میں امن و امان قائم کرنا اس قومی نظام کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے لیے داخلی سیکیورٹی فورسز، یعنی پولیس یا وزارتِ داخلہ کا نظم و نسق کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طریقے دوسرے ملکوں سے تحفظ کے لیے فوجی

طاقت اور قوت یا عسکری سپہ سالار کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر جن بنیادی امور کو ایک قومی ریاست کی تشکیل کے لیے لازمی قرار دیا، ان میں سے ہر ایک کے معیارات بتلائے کہ سپہ سالار کی کیا خصوصیات اور تقاضے ہوں؟ ملک کے داخلی نظم ونسق میں امن وامان کو یقینی بنانے والی سیکیورٹی فورسز کے بنیادی اساسی امور کیا ہوں؟ انتظامیہ کے معیارات کیا ہوں؟ منتخب نمائندوں کے کیا معیارات ہوں؟ آئین اور قانون کی تشکیل کی بنیادی اساسیات کیا ہوں؟

شاہ صاحبؒ کے ہاں قانون ساز جماعت کو سوسائٹی کی مصالح ومفاسد معلوم ہونے چاہئیں اور اس کی بنیاد پر وہ علم التشریع کے بنیادی اساسی اصول سے واقف ہو۔ قانون سازی ایک مستقل عمل ہے اس لئے سماجی لہروں کو سمجھنا اور اُن سماجی لہروں کے تناظر میں انسانی مسائل کا ادراک کر کے اُن کا حل کرنے کی بروقت قانون سازی کرنا ضروری ہے کہ اجتماع اس کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔

اور پھر ایک اور اہم ترین شعبہ شاہ صاحبؒ نے قومی ریاست کے لیے بیان کیا ہے کہ اُس سوسائٹی کو ہموار طریقے سے آگے بڑھانے کے لیے تعلیم وتربیت کا نظم ونسق قائم کرنا ہے۔ کوئی سوسائٹی اس وقت تک ترقی نہیں کرتی، جب تک کہ علم وشعور پھیلانے والی دانش گاہیں موجود نہ ہوں۔ ایسے تعلیمی ادارے موجود نہ ہوں، جو ان تمام امور کی تربیت دیں کہ تجارت اعلیٰ درجے پر کیسے کرنی ہے؟ عمارتیں اور بلڈنگیں کس طریقے سے بنانی ہیں؟ انسانی صحت کے علاج کے لیے ڈاکٹر اور طبیب کیسے بنانے ہیں؟ اُن کے معیارات کیا ہوں گے؟ اسی طریقے سے مسلمان معاشرہ ہے تو وہاں دین کے پڑھنے پڑھانے کا علمی منہج بھی واضح ہونا چاہیے۔ (اس علمی منہج کی تفصیلی گفتگو علم اسرارِ دین کے تناظر میں ہو چکی ہے) شاہ صاحبؒ کے نظریات اور افکار، دوٹوک علمی تشریح کرتے ہیں اور علمی منہج واضح کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک ہر معاشرے میں یہ چھ بنیادی امور یا وزارتیں اور ان کے ذمہ دار افراد کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ یعنی تعلیم، داخلی سلامتی، سرحدوں کا تحفظ، قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ کا پورا نظام ضروری ہے۔ شاہ صاحبؒ نے واضح کیا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں کسی بھی اجتماع کو ان شعبوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، بلکہ جیسے جیسے سوسائٹی کا ارتقا ہوتا ہے، ضرورتیں ہوتی ہیں، وزارتیں اور ڈویژن بڑھتے رہتے ہیں، اُن میں ترمیم وتنسیخ بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہ تو صرف اصولی قواعد وضوابط کی بات ہو رہی ہے۔ یہاں لازمی اور ضروری امور ذکر کیے گئے ہے۔ اس سے ارتفاقِ ثالث یا قومی سطح کا معاہدۂ عمرانی اپنی ایک شناخت پیدا کرتا ہے۔ اس سے قوم ترقی کرتی ہے اور پوری اجتماعیت ہموار طریقے سے آگے بڑھتی ہے۔

ارتفاق رابع یا بین الاقوامی نظام

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس طرح ریاستیں اور ممالک یا قومی ریاستیں اور ڈھانچے کھڑے ہو جائیں اور ممالک بن جائیں تو پھر ایک ضرورت پیش آتی ہے کہ ملکوں کے درمیان بھی ایک بین الاقوامی نظام ہونا

چاہیے، انسانی فائدے یا انسانی اجتماعیت کا یہ چوتھا مرحلہ ہے، جس کو ارتفاقِ رابع کہا گیا، کیوں کہ ملکوں کے درمیان بھی جھگڑے ہوسکتے ہیں، کوئی طاقت ور ملک کسی چھوٹے ملک کو ہڑپ کرسکتا ہے، امن وامان کو تباہ کرسکتا ہے، معاشی بدحالی میں مبتلا کرسکتا ہے، ان کی منڈیوں پر قبضہ کرسکتا ہے اوران پر ظلم وستم مسلط کرسکتا ہے تو ضرورت پیش آتی ہے کہ یہ ممالک مل کرایک بین الاقوامی ڈھانچہ قائم کریں۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک ارتفاقِ رابع یا بین الاقوامی نظام یہ ہے کہ جوممالک کے درمیان باہمی تعلقات یا ربط موجود ہے، وہ انسانی بنیادوں پر ہے، یعنی انسانی اجتماعیت کے تناظر میں اُس ربط کی حفاظت کرنا، ہرقوم کے حقوق کا تحفظ کرنا، مذکورہ چھ امور میں ان کی معاونت اوراس کوزیادہ بہتر سے بہتر کرنا اور اس کے لیے اقدامات کرنا۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ بین الاقوامی قانون تمام ملکوں اور ریاستوں کا تسلیم شدہ ہواور یہ تسلیم کرنا کسی جبر سے نہیں، بلکہ ان کے جمہوری اساس پر منتخب نمائندوں اور اُن کے ممالک کی آزادمرضی سے وجود میں آئے۔ گویا آج کی طرح صرف پانچ ویٹو پاور رکھنے والے ملک (امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اورچین) اپنا بنایا ہوا قانون اور ضابطہ دنیا کے ایک سو بانوے ملکوں پر مسلط نہ کریں، یہ بین الاقوامی قانون اور ضابطہ نہیں ہے۔ تعلقاتِ عوام کی یہ بنیاد نہیں ہے۔ انسانیت کی ترقی کے بین الاقوامی قانون پر عمل درآمد کے لیے ایک اتھارٹی کی ضرورت ہے۔ اس اتھارٹی کے ٹائٹل کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''خلیفہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی وہ تمام انسانوں کے لیے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ''جاعل فی الأرض خلیفه.'' قرار دے کر بھیجا ہے، بلاتفریق رنگ، نسل و مذہب، اللہ کا نائب بن کر کل انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔

خلافت دراصل وہ بین الاقوامی نظام ہے، جوممالک کے باہمی تعلقات اوران کوعدل وانصاف پر قائم کرنے کے لیے کردارادا کرے۔ اس کا تعلق انسانی مسائل کے حل سے ہے۔ امن وامان کو یقینی بنانے سے ہے۔ بلاتفریق رنگ، نسل ومذہب معاشی خوش حالی اور ترقی سے ہے۔ یہ کسی خاص مذہب کی خلافت نہیں۔ انسانی اصولوں کی خلافت ہے۔ انسانی اصولوں کی ترقی کے لیے کردارادا کرنا اوراسے اسی طریقے سے ایک بین الاقوامی فورس اور قانون بنانا ہے۔ تمام انسانوں کی مجموعی ترقی کا تعلیمی نظام بنانا ہے۔ عالمی عدالتِ انصاف بنانا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بین الاقوامی سطح پر عدل، امن اور معاشی خوش حالی قائم کرنے کے لیے ضروری اور یقینی بنانا اس خلافت کا کام ہے۔ یہ بین الاقوامی نظام ہے، اس کے لیے ایک بین الاقوامی طاقت کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اتھارٹی تمام انسانوں کوانصاف فراہم کرے۔

یہ چار بنیادی ارتفاقات اوران کے مراحل، اوراجتماعی تشکیل دینے کے حوالے سے ان کے اصولِ کلیہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک ایسے اصولِ مسلمہ ہیں کہ یہودیت ہو، عیسائیت ہو، ہندومت ہو، دنیا کا کوئی مذہب اور فرقہ ہو، اسلام کی تعلیمات ہوں، تمام کے ہاں عقلی، نقلی اور کشفی طور پر ثابت شدہ اور مسلمہ ہے۔ کسی کواس سے اختلاف نہیں ہوگا۔ اس سے اختلاف کرنے والے ممکنہ طور پر دو طبقے ہوسکتے ہیں: ایک بالکل بے وقوف، جو جانوروں جیسے ہوتے

ہیں۔ یا مجنون اور پاگل یا شریر پسند طبیعتیں جو کسی بھی سطح کے کسی قانون کو نہیں مانتیں ورنہ دنیا کی مہذب انسانیت، تمام مذاہب اور ملتیں، تمام سکول آف تھاٹ (schools of thought) اس کو بنیادی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

دورِ زوال میں حکمت عملی

شاہ صاحبؒ نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سوسائٹی کی ضرورت تو یہ ہے کہ یہ چاروں ارتفاقات سوسائٹی کی کل انسانیت کی شیرازہ بندی کے لیے کردار ادا کریں لیکن اگر انسانیت پر زوال آجائے، کمزوری پیدا ہوجائے اور کسی مرحلے پر ارتفاقِ رابع ٹوٹ جائے، لوگوں کے درمیان لڑائی اور فساد پیدا ہوجائے تو پھر بہت لازمی اور ضروری ہے کہ ہر قوم اپنا قومی ارتفاق یا قومی جمہوری نظام اور اپنا ریاستی ڈھانچہ محفوظ کرنے کی فکر کرے۔ اقوامِ عالم کی فکر سے واپس لوٹ کر اپنے قومی ارتفاق، اپنے ریاستی ڈھانچے اور اپنی جغرافیائی حدود کے بنیادی تقاضوں کو ان اصولوں پر قائم رکھنے کے لیے مزید کردار ادا کیا جائے۔ یہ بڑی اہم ترین حکمتِ عملی ہے کہ اگر کل انسانیت کے مفاد کا بین الاقوامی نظام نہیں ہے تو قومی ریاستی نظام کو اس کی اساس پر بنایا جانا ضروری ہے۔

اور اگر بالفرض کوئی قومی ریاست ان اصولوں پر قائم نہیں ہے وہ بھی ٹوٹ رہی ہے اور بکھر رہی ہے اور وہاں بھی مفاد پرست طبقہ غالب آرہا ہے تو پھر کم از کم ارتفاقِ ثانی کی سطح کے عقل مند، باشعور لوگ، اپنی ایک اجتماعیت قائم کریں۔ اپنی جماعت بنائیں، ان اصولوں کے فروغ اور پھیلاؤ اور ان کو قائم کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کریں اور اس کی جدوجہد اور کوشش کریں۔ ایسا نہیں کہ سوسائٹی کو تباہی اور بربادی کے دہانے پر جانے کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر ارتفاقِ ثانی بھی ٹوٹ گیا تو یہ انسانیت کی تباہی ہے کہ ان اجتماعی اصولوں پر دعوت دینے، محنت کرنے، جدوجہد اور کوشش کرنے والی کوئی جماعت بھی نہیں رہی تو انسانی تباہی کا راستہ کھل گیا۔

حجۃ اللہ البالغہ میں ایک بڑی اہم بات شاہ صاحبؒ نے یہ بھی کہی کہ:

"**إعلم ان الرسوم من الارتفاقات، هى بمنزلة القلب من جسد الإنسان.**"

کہ ارتفاقات کے اصول یا بنیادی امور اور ان کے قوانین اور ضابطوں کی اہمیت ایسی ہے جیسے انسانی جسم میں دل کی کہ دل کام کرنا چھوڑ جائے تو انسان ختم ہوجاتا ہے۔ ارتفاقات درست طور پر قائم نہ ہوں تو معاشرہ تباہ ہوجاتا ہے۔ اجتماعیت کے یہ اصول بروئے کار نہ لائے جائیں تو معاشرے کی موت ہے۔

مزید کہتے ہیں کہ یہی ارتفاقات ہیں، نوامیس الٰہیہ میں جن کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی مقدس نوشتے؛ تورات، زبور، انجیل اور خود قرآن حکیم میں انھیں امور کو روبہ عمل لانے کے بنیادی اشارات اور رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ اور اسی کے لیے انبیا علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے۔ ان کا جملہ ہے:

"**و إياها قصدت الشرائع اوّلاً و بالذات.**"

یعنی تمام شریعتوں میں اور بالخصوص شریعتِ محمدیہ میں اوّلاً و بالذات (essentially and

directly) اجتماعیت کے یہ امور پہلا ہدف ہیں۔

آج بڑی عجیب بات ہے کہ مذہب کے نمائندوں کے ہاں عقائد تو بجا طور پر اہمیت رکھتے ہیں لیکن عقائد کے تناظر میں ارتفاقات کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ عبادات کی اہمیت پر گفتگو کی جاتی ہے، لیکن ارتفاقات یا اجتماعی تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ سارے لوگ میری عبادت کریں تو میری خدائی میں کوئی اضافہ نہیں۔ اور سارے لوگ میرا انکار کر دیں، کفر کریں، عبادتیں چھوڑ دیں تو میری خدائی میں کوئی کمی نہیں۔ یہ عبادات اور عقائد بھی انسانی فلاح و بہبود کے لیے ہیں۔ جیسا کہ تفصیل سے علم اسرار دین کے حوالے سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اور ان کا ہدف بھی دراصل انسانی اجتماعیت ہے، یعنی اس کرۂ ارض پر رہنے والے انسانوں کے اجتماعی تقاضوں کی تہذیب اور ترتیب قائم ہوتا کہ اللہ سے تعلق اور خدا پرستی کا لازمی نتیجہ انسان دوستی کی اجتماعیت کی صورت میں ظاہر ہو۔ تمام شریعتوں کا بنیادی پہلا اور ذاتی مقصد یہی ارتفاقات کے طریقے ہیں کہ اجتماعیت کے ان اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔

سماجی تشکیل کے دو مناھج

ان اصولی امور پر ان قاعدوں کی روشنی میں ریاستوں اور بین الاقوامی نظام قائم کرنے کے دو منہج یا پہلو ہیں:
ایک طریقۂ حکما ہے کہ جن قوموں کے نزدیک جو عمدہ سائنس دان یا کوئی حکیم یا کوئی نئی ایجادات اور دریافت کرنے والا خواہ نظریات کے حوالے سے ہو، ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہو، اجتماعی تقاضوں کے حوالے سے ہو، تو حکما کے طے کردہ اصولوں پر نظام بناتے ہیں۔ جیسے آج یورپ کا نظام قائم ہے۔ انھوں نے جس حکیم کو مانا، مثلاً روسو کو مانا، ڈارون کو مانا، فیور باخ کو مانا، ایڈم سمتھ کو مانا، کارل مارکس کو تسلیم کیا، تو حکما کے طے شدہ نقطۂ نظر کے مطابق جو خیالات ہیں، اس کے تناظر میں انھوں نے اپنا نظام بنایا۔ اور دوسرا طریقہ انبیا علیہم السلام کے طریقے اور اُن کے طے کردہ اصولوں کا ہے اور بالخصوص اس دور میں امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طے کردہ طریقوں اور اصولوں کے مطابق قومی ریاستوں اور بین الاقوامی نظام کی تشکیل کا عمل ہے۔

یہ دو دائرے ہیں۔ دونوں دائروں کا سمجھنا اپنی جگہ پر ضروری ہے۔ وہ معاشرہ یک طرفہ ہوگا جو صرف انسانی جسم کے تقاضوں کی تکمیل کے تناظر میں نظام بنائے گا۔ چناں چہ عام طور پر حکما، خاص طور پر مادی فلسفے کو سامنے رکھنے والے لوگ (جس پر کل پرسوں ہم نے گفتگو کی تھی) محض مادی نقطۂ نظر سے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ جنھیں عقل کی بنیاد پر مشائین کہا جاتا ہے۔ انبیا کی تعلیمات کی حقیقت انسانی روح اور انسانی جسم کی جبلت یعنی بہیمیت اور مَلَکیت کے تناظر میں ہے، یعنی ایسا اجتماعی نظام ہو، جس میں اس کی روح بھی ترقی کرے اور اس کے جسم کے ارتفاقات اور ضرورتیں بھی ترقی پذیر ہوں۔ یہ جامع تصور انبیا علیہم السلام نے دیا۔

شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تو چند اشارات کیے ہیں مگر اس کو پوری تفصیل کے ساتھ البدور البازغہ کے آخری مقالے میں بیان کیا ہے کہ ملتیں کیسے بنتی ہیں، ان کی اساس پر ارتفاقات کا نظام کیسے وجود میں آتا ہے، ملت مجوس نے کیسے بنایا، ستارہ پرست (نجامین) نے کیسے بنایا، مادہ پرست (طبیعین) ملت کیسے وجود میں آئی اور ملت ابراہیمیہ حنیفیہ کیسے وجود میں آئی اور اس کے ارتقا کے مراحل کیا ہیں؟ اور ملتِ ابراہیمیہ حنیفیہ کا آخری ایڈیشن امام الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا پیش کیا؟

سماج کے لئے تباہ کن نظام

لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ حکما کے طریقے پر سوسائٹی کے اجتماعی تشکیل ہو یا انبیا کے طریقے پر سوسائٹی کی تشکیل ہو، کہ اگر اس نظم کو چلانے والے یا اس اجتماع کو قائم کرنے والے حکمران طبقے انفرادی اور طبقاتی مفادات کی بنیاد پر اس ریاستی ڈھانچے، قومی نظام یا بین الاقوامی نظام تشکیل دیں گے تو یہ تباہی کا راستہ ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ حکما کی دریافت کردہ حکمتیں ہوں یا انبیا کے دریافت کردہ طریقے ہوں، اپنے اصلِ قانون کے اعتبار سے درست ہوتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ معاشروں پر ایسے لوگ قابض ہو گئے، سربراہ بن گئے۔ قومی سطح پر یا بین الاقوامی سطح پر سیاست پر قابض ہو گئے اور حکمران طبقے بن گئے کہ جن کے مفادات جزوی ہیں اپنے گروہ، اپنی نسل، اپنے طبقے کے حد تک۔ جیسا کہ ڈاکٹر اقبال نے یورپ کے بارے میں کہا کہ ۔

اگر قبول کرے دین مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلمان رہے گا پھر بھی غلام

تو نسل کی بنیاد پر جو تشکیل کا عمل ہے کہ یہ نسل اعلیٰ (superior) ہے۔ یہ بزنس کلاس اونچی ہے، یہ لینڈ لارڈ اونچے ہیں، یہ ''رائ جزئی'' کہلاتی ہے۔ اور رائ جزئی والے حکمران طبقے بنتے ہیں تو وہ انسانی نقصان پہنچانے والے پیشے (اکساب ضارۃ) اختیار کرتے ہیں۔ درندوں والے اعمال، شیر جیسے پھاڑنے چیرنے والے اعمال (اعمال سبعیۃ) کرتے ہیں۔ ظالمانہ ٹیکس لگاتے ہیں، استیصال کرتے ہیں رعایا کا۔ حال آں کہ سیاست اور حکومت تو اس لیے تھی کہ لوگوں کی تمام جماعتوں میں امن، جان، مال، عزت و آبرو کا تحفظ اور ان کے پیشے کو بڑھنے اور فروغ دینے کے لیے کردار ادا کیا جاتا، مگر اُلٹا معاملہ ہو گیا کہ محنت کش تاجروں سے مال سمیٹ کر ایک مخصوص حکمران طبقے کی کمپنیوں اور ان کے مفادات کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ آزادی اور حریت کے قومی تقاضوں کے مطابق فیصلے کرنے کے بجائے غیر ملکی طاقتوں کی ڈکٹیشن پر نظام بنایا جاتا ہے وغیرہ۔ جب ایسے انفرادیت پسند طبقاتی سوچ رکھنے والے یا نسل پرست اور ایک مخصوص جماعت کی نمائندگی کرنے والے بزنس مین یا لینڈ لارڈ کسی سوسائٹی پر مسلط ہوتے ہیں تو وہاں طریقۂ حکما کا عنوان ہو، وہ بھی فیل ہو جاتا ہے یا طریقۂ انبیا کا نام ہو، وہ بھی فیل

ہو جاتا ہے۔ دونوں کے نتائج منفی نکلتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ حکمران طبقہ جو شروع میں ظلم کی طاقت کے بل بوتے پر آتا ہے تو ظلم کے نتیجے میں کوئی آدمی ان کے سامنے بولتا نہیں۔ لوگ جبر اور قہر کی وجہ سے اُن کے تابع رہتے ہیں اور پھر سوسائٹی کے جو مفاد پرست طبقات بڑے بڑے حکمرانوں کے خوشامدی، اُن کا تھیلا اٹھانے والے، ان کے مدد و معاون بن جاتے ہیں۔ مافیاز (mafias) وجود میں آجاتے ہیں، جو تاجر چھوٹا ہوتا ہے، وہ بڑے بزنس مین کا چیلا ہوتا ہے۔ چھوٹا کاشت کار بڑے فیوڈل لارڈ کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ ایک چھوٹے شعبے سے فرد تعلق رکھتا ہے، لیکن وہ بڑی چھلانگیں لگا کر، بڑے لوگوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر کے مارکیٹ پر اپنی دہشت پیدا کرتا ہے۔ یہ بہت بڑی خرابی ہے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ظلم و ستم کا نظام ایک مستحکم حالت پیدا کر لیتا ہے اور جو قوم کے انصاف پسند طبقات ہیں، شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں ''اخریات القوم''، یعنی پچھلی صفوں پر یا پچھلی بنچوں پر بٹھا دیے جاتے ہیں اور وہ خاموش رہتے ہیں غصے سے۔ خواہش ضرور رکھتے ہیں کہ سسٹم بدلے، لیکن جبر و قہر کے عالم میں وہ غصے سے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں یا گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کچھ نیک لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ سیاست ہی بُری ہے، یہ ارتفاقات اور معیشت کی بحث ہی بُری ہے۔ بس نمازیں پڑھو، روزے رکھو، تسبیحات گھماؤ۔ دنیا ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ یوں مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے یہ منظر نامہ اپنے دور کی سوسائٹی کا قیصر و کسریٰ کے حالات کے تناظر میں بیان کیا ہے، جس کی تفصیلات پچھلے لیکچرز میں جا بجا بیان کی جاتی رہیں، اس حوالہ سے شاہ صاحبؒ کا یہ تاریخی جملہ ہے کہ:

''ما تراه من ملوک بلادک يغنيک عن حکاياتهم.''

تیرے گرد و پیش کے حکمرانوں کے کرتوت، تمھیں قیصر و کسریٰ کے حالات یا پچھلے ظلم کی کہانیاں بھلا دیں گے۔ آج بھی گرد و پیش میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں کیا! بلکہ برصغیر کی غلامی کے اس دو سو سال میں یہی کچھ ہوا۔

سماجی تبدیلی کی ذمہ داری

اس موقع پر فریضہ کیا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا:

کہ وہ لوگ جو مفادِ عامہ اور رائے کلی کی سوچ رکھتے ہیں، ان پر واجب اور فرض ہے کہ وہ اپنی جد و جہد کے تمام ذرائع و وسائل خرچ کریں۔ اجتماعیت کے بنیادی علم کے فروغ اور اس حق کے امر کو غالب کرنے کی شعوری جد و جہد اور کوشش جاری رکھیں۔ اگر وہ بھی مایوس ہو کر بیٹھ گئے تو پھر انسانیت کی تباہی و بربادی کا راستہ کون روکے گا؟ ان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اجتماعیت کے علم کی اشاعت کریں، اسے فروغ دیں اور اس کے پھیلاؤ کے لیے کام کریں،

حق بات کو لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ اور جو باطل طور طریقے اجتماعیت کی تباہی اور بربادی کے ہیں، ان کو اپنے علم وشعور کی بنیاد پر واضح کریں کہ یہ اجتماعیت کا نقصان ہے، یہ انسانی مفاد کے خلاف بات ہے اور باطل کا راستہ روکیں۔ اور اس راستہ روکنے کے دو طریقے بھی شاہ صاحبؒ نے بیان کیے:

"رُبما لم یمکن الا بمخاصمات أو بمقاتلات."

یعنی ایک شکل ہے کہ آپ دوسروں سے مباحثہ، مکالمہ، مخاصمہ، برابر کی سطح پر اُن سے بات چیت اور گفتگو کریں، اُن سے عمدہ طریقے سے مجادلہ کریں، دلائل سے ثابت کریں اور منطق (logic) سے ثابت کریں۔ یہاں تشدد کے راستے کی بات نہیں ہو رہی یہاں تک کہ رائی کلی یا مفادِ عامہ کا عملی کردار ادا کرنے والوں کی ایک منظم قانونی طاقت بن جائے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ مکرمہ میں تیرہ سال کی محنتوں کے نتیجے میں وہ جماعت وجود میں لائے پھر نظام کے قیام کے بعد اگلا مرحلہ "مقاتلات" پر بھی آسکتا ہے۔ مگر پہلے مرحلے میں تو اپنے اوپر، اپنی ذات پر، اپنی سوسائٹی میں، اپنی اجتماعیت میں، اپنی شیرازہ بندی میں، مباحثے اور مکالمے کے ذریعے سے ان اجتماعی اصولوں کے علم وشعور کے فروغ کا عمل واجب ہے۔

اور شاہ صاحبؒ کے ہاں یہ کام کرنا فرض نماز یا بنیادی فرائض جو اللہ نے مقرر کیے ہیں، ان کو ادا کرنے کے بعد دنیا کا افضل ترین عمل یہی ہے۔ تمام نوافل، مستحبات، وظائف اور مسنونات میں سے سب سے افضل ترین عمل (افضل اعمال البر) اُس زمانے میں یہی جدوجہد اور کوشش یعنی اس علم کی شمع کو روشن کرنا اور اس اجتماعیت کا شعور حقائق اور دلائل کے تناظر میں پھیلانا ہے اور یاد رکھیے کہ سوسائٹی میں آرائے جزئیہ کے ماننے والے (جیسے ابھی مفتی سعید الرحمٰن صاحب نے بھی ذکر کیا) تحریک پر تحریک چلاتے ہیں، لیکن اس تحریک کے پیچھے جو علم ہے، شعور ہے، منظم اجتماعیت، منظم جدوجہد، مکالمے اور مباحثے کا انداز اور اُسلوب ہے، وہ تو ہے نہیں، صرف تشدد اور انتہا پسندی کی بنیاد پر لڑائی بھڑائی کا عمل، قتل وغارت گری ہے۔ دنیا میں اس سے تو معاشرے نہیں بدلتے۔

آج کا تقاضہ

جن جن معاشروں میں ایک پائیدار تبدیلی یا تشکیل نو ہوئی ہے، علم وشعور اور نظریے کی اساس پر جدوجہد اور کوشش کرنے والی اجتماعیت کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ محض مار دھاڑ سے تو دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتے۔ آج ہم نے یہ جو تشدد کا راستہ، دہشت گردی اور قتل وغارت گری کا راستہ اپنایا ہے، یہی خرابی کا راستہ ہے۔ علم وشعور کا راستہ، عدمِ تشدد کے اصول پر جدوجہد ہے۔ دیکھو! ہم مسلمانوں کے زوال پر بہت کڑھتے ہیں، مگر زوال سے نکلنے کے لیے ہم کام نہیں کرنا چاہتے۔ آپ بتلائیے کہ مسلمانوں کا یہ زوال جنگِ عظیم اوّل میں آپ کی خلافت کے بین الاقوامی نظام کے خاتمے سے ہوا اور اس برعظیم پاک وہند میں انگریز کی آمد اور مغلیہ سلطنت کے زوال سے شروع ہوا۔ آپ نے عسکری

بنیادوں پر اس ملک کے اندر رہتے ہوئے 1857ء تک جدوجہد اور کوشش کی، لیکن شکست کھائی اور 1857ء سے لے کر 1919ء تک بہ شمول جنگ عظیم اوّل 18-1914ء کے دورانیے میں بین الاقوامی طاقت کے ساتھ مل کر جنگ لڑی کیوں کہ خلافت عثمانیہ ہماری بین الاقوامی حکومت تھی۔ 1920ء کے بعد سے دنیا میں ریاستیں قومی سطح پر وجود میں آنے لگیں۔ ہمارا بین الاقوامی راستہ ختم ہوگیا کیوں کہ بین الاقوامی نظام ٹوٹ گیا۔ اب اس کے بعد نئی حکمت عملی کی ضرورت تھی۔

اس لیے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (1920ء) جب مالٹا سے واپس آئے، پچاس سال انگریز کے خلاف مسلسل جدوجہد اور کوشش کی۔ تحریکِ ریشمی رومال، جو خلافت عثمانیہ کی بین الاقوامی طاقت کے تعاون سے ہندوستان سے برطانوی سامراج کو نکالنے کے لیے ایک عسکری جدوجہد اور کوشش تھی، ناکام ہوگئی۔ تو سوال آیا کہ کیا ناکامی کے بعد پھر بھی بندوق اٹھائے رکھیں؟ تو طریقۂ کار اور حکمتِ عملی حضرت شیخ الہندؒ نے متعین کی کہ اب عدمِ تشدد کے اصول پر اس اجتماعیت کی جدوجہد اور تحریک کے فروغ کے لیے کام کرنا ہے۔ اب قومی ریاستیں وجود میں آرہی ہیں تو اب ہمیں قومی جمہوری بنیادوں پر اپنی ریاستوں کی تشکیل کے لیے کردار ادا کرنا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اسی ولی اللّٰہی فلاسفی کی اساس پر استنبول (ترکی) میں اور مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر بین الاقوامی حالات کا جائزہ لینے کے بعد بات کی کہ قومی ریاستوں کے زمانے میں ہم جب تک اپنا قومی جمہوری نظام مضبوط نہیں بناتے، یہاں کی تمام نسلوں، فرقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے بنیادی اصولوں پر، انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ، وزارتِ داخلہ، وزارتِ خارجہ وغیرہ وغیرہ پر اپنے امور نہیں بناتے، اس وقت تک ہماری طاقت اور قوت نہیں پیدا ہوسکتی۔ دشمن سے اپنے حقوق چھیننے کا راستہ عوامی اور جمہوری طور پر ہے۔

الغرض حریت پسند علما نے پچاس ساٹھ ستر سال تک انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جنگ لڑی، خلافت کی بقا کے لیے کردار ادا کیا، تحریکِ خلافت چلائی، بین الاقوامی اسلامی نظام کی بقا کے لیے کردار ادا کیا، مگر حالات بدلے اور ہماری طاقت ٹوٹ گئی۔ جنگِ عظیم اوّل کے دو فاتح برطانیہ اور فرانس سامنے آئے اور پھر یورپ کی بندر بانٹ اس پر کم نہیں ہوئی تو جنگِ عظیم دوم میں دو فاتح روس اور امریکا سامنے آئے۔ ان چار ویٹو پاورز نے اقوامِ عالم کا نظام بنایا اور ریاستوں کی تشکیل کی۔ کیا ان چاروں میں سے کوئی ایک طاقت بھی اسلامی تھی؟ کوئی بھی نہیں۔ اس وقت بین الاقوامی نظام قائم کرنے والے یا سرمایہ داری نظام کے حامل تھے، یا سوشلزم کے۔ سوال یہ ہے کہ اب اُن کے زیرِ سایہ یا اُن کے ساتھ معاہدے کر کے جو ریاست وجود میں آئے گی، اس ریاست میں اسلام کا نظام قائم کیسے ہوگا؟ ایک ہی راستہ تھا کہ ہم قومی ریاست کی تشکیل کے اسلامی اصولوں کو سامنے رکھتے، وہ تو ہم نے پیش نظر نہیں رکھا۔ ہم بین الاقوامی معاہدات میں جکڑ لیے گئے۔ چنانچہ آج آپ شرعی عدالت کے اندر جتنا مرضی سود پر بحث کر لیں اور ثابت کر دیں کہ سود حرام ہے، لیکن آپ عملاً کچھ نہیں کر سکتے کیوں کہ عالمی نظام بریٹن وڈز کانفرنس (Bretton

(Woods Conference, 1944) میں جب طے کرلیا گیا کہ دنیا بھر کا مالیاتی ڈھانچہ اس اصول پر چلے گا، جسے چاروں ویٹو پاورز سمیت چوالیس ممالک نے قبول کرلیا۔ پھر اسی طریقے سے 1947ء تجارت کے اصول اور گیٹ معاہدہ (GATT) سامنے آیا۔ قرضوں کی معیشت کا معاہدہ سامنے آیا۔ عالمی بینک وجود میں آیا تو 1947ء کے بعد پاکستان کے سٹیٹ بنک نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک سے معاہدہ کرلیا آپ ان معاہدات کے اندر بندھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب تک اپنی ریاستی طاقت، اپنے فیصلے خود کرنے اور رائے کلی کے مطابق اپنا سسٹم بنانے کا اجتماعی شعور بیدار نہیں کرتے، علم نہیں پیدا کرتے، اجتماعیت نہیں تشکیل کرتے تو محض دیوانے کے خواب ہی کی بات ہوگی کہ ہم کہیں کہ ایسی حالت کے اندر ہماری قومی ریاست کی تشکیل ہو۔

مسلم امت کی موجودہ صورت حال

اسلام کے نام پر ملکوں کی جو تقسیم کی گئی، ایک خلافتِ عثمانیہ کے ستاوَن ملک بنا دیے گئے۔ ایک جزیرۃ العرب کو سعودی عرب، عمان، کویت، قطر، بحرین اور سات امارتوں میں بانٹ دیا گیا۔ اور پورے مشرقِ وسطیٰ کے حصے بخرے کر دیے گئے۔ پورا افریقا بھی بندر بانٹ کر دیا گیا۔ اس برعظیم پاک و ہند کے سات آٹھ ملک بن گئے تو ملکوں کی تقسیم در تقسیم کیا اجتماعی طاقت پیدا کرے گی؟ حال یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان ملک میں چلا جائے تو اس کو ریاستی اسلامی حقوق تک نہیں ملتے۔ وہ خارجی (foreigner) کا خارجی رہتا ہے۔ اس لیے قومی ریاستی دور کے اندر قومی طاقت کا پیدا کرنا ضروری تھا، مگر پراگندہ فکری کا یہ حال ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کے نام پر قومیت کو پہلے حرام قرار دیا گیا کہ اسلام تو قومیت کا انکار کرتا ہے۔ حال آں کہ ریاستی حدود میں ہم اقوامِ متحدہ کے معاہدے سے جڑے ہوئے ہیں اور پھر بھی کہتے ہیں کہ اسلام قومیت کا انکار کرتا ہے۔ یعنی معاہدے میں ہم قومیت مان رہے ہیں، لیکن قومیت کی اساس کو کفر قرار دے رہے ہیں۔ اسی طریقے سے ہم بین الاقوامی معاہدات کے تحت جمہوریت کے پابند ہیں، مگر جمہوری تصور کو ہی خلافِ اسلام بنانے کے لیے یہاں کے اسلام پسند ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور خلافت بمقابلہ جمہوریت کے نعرے لگاتے ہیں۔

ولی اللّٰہی فکر کی عصری اہمیت

امام شاہ ولی اللہ اسلامی فکر کی اساس پر تین سو سال پہلے کہہ گئے کہ قانون جماہیر الناس کا بننا چاہیے، اجتماعی طاقت و قوت اور پارلیمنٹ کے عقل مند لوگوں کی اساس پر نظام بننا چاہیے۔ مگر ہم نے شاہ ولی اللہ کا فکر چھوڑ کر خود ساختہ اسلامائزیشن، فرقوں کی بنیاد پر کی ہے، اس کے اثرات اور نتائج آج ہم بھگت رہے ہیں۔ شاہ صاحب کو کسی مفکر سے متاثر قرار نہیں دیا جاسکتا، مثلاً روسو جو شاہ صاحبؒ سے سولہ سال بعد فوت ہوا ہے۔ جنیوا میں پیدا ہوا۔ وہاں کی زبانوں میں اس نے تحریر لکھی تو کیا شاہ صاحبؒ نے وہ زبان پڑھی تھی؟ مارکس تو شاہ صاحبؒ سے سوسوا سو سال بعد آیا۔ ایڈم سمتھ کی کتاب سب سے پہلے 1776ء میں چھپی اور شاہ صاحبؒ 1735ء میں یہ بات کہہ رہے ہیں۔ تو شاہ صاحبؒ پر تو یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ شاہ صاحبؒ نے یورپ

کے کسی فلسفے سے متاثر ہو کر یہ بات کہی۔ ہاں! بعد کے اسلام پسندوں کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے کہ اُن کی سوچ کسی سے متاثر ہو کر پروان چڑھی ہو۔

آج ہمیں غفلت کے تمام پہلو ختم کرنے ہوں گے۔ یہ جو ہم نیند کی حالت میں ہیں اور افتراق و انتشار اور اجتماعیت گریز فرقہ واریت کے اندر مبتلا ہیں، اس سے نکل کر عقل و شعور اور فہم و بصیرت کی اساس پر دین کے اس فکر پر غور کرنے کے لیے وقت نکالیں۔ میں اہلِ علم سے درخواست کروں گا کہ پوری توجہ کے ساتھ اس علم کو پہلے پڑھیے۔ پھر سوالات ضرور قائم کیجیے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ ہم نے بتا دیا، وہ حرفِ آخر ہے۔ یہ تو سوچنے کے مواقع ہیں۔ اس علم و فکر کو سمجھے بغیر بات آگے نہیں بڑھے گی۔ پڑھیے کہ شاہ صاحبؒ کا بنیادی فکر کیا ہے؟ وہ اجتماعیت کی تشکیل کے بنیادی امور کیا بیان کرتا ہے؟ معاشی نقطہ نظر سے کیا سسٹم بیان کرتا ہے؟ کون سا علمی منہج اور فکری ڈھانچہ مربوط طور پر بیان کرتا ہے اور اس پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

کلماتِ تشکر

آخر میں ان لیکچرز کو یہاں منعقد کرانے پر یونیورسٹی کی انتظامیہ کا شکر گزار ہوں کہ ہمیں موقع دیا گیا کہ بات چیت اور گفتگو کے ذریعے سے ہم ایک مکالمہ کر سکیں۔ غور و فکر کی اس خوب صورت محفل کو سجانے کی وائس چانسلر صاحب نے منظوری دی، ان کا بھی شکریہ۔ اور موسیٰ پاک چیئر کے ہمارے محترم اور بہت ہی معزز اور بہت ہی علمی شخصیت مفتی ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب کا بھی شکریہ کہ انہوں نے یہ خوب صورت مجلس سجائی اور شعبہ علومِ اسلامیہ کے سربراہ ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب کا شکریہ، انھوں نے پچھلی دفعہ پُرخلوص دعوت دی اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اس دعوت کو قبول کر سکے اور اس مجلس میں ہمیں یہ بات کرنے کا موقع ملا۔

اور آخر میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا بھی شکر گزار ہوں کہ توفیق دی کہ شاہ ولی اللہ کے فکر کی کچھ بنیادی باتیں بیان کی ہیں اور یہ فکر ہمیں اپنے مرشد حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے، اپنے استاذ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کی صحبت و تربیت اور بالخصوص امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کے عمیق مطالعے سے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا۔ اس میں جو صحیح اور حق ہے، تو یقیناً یہ اللہ کی توفیق سے ہے۔ اور اس میں جو ہم سے بیان کرنے میں کمی اور کوتاہی ہوئی تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور ہمیں اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان ارید الا الاصلاح مااستطعت

و ما توفیقی الا باللہ علیه توکلت و الیه اُنیب.

صدق اللہ العظیم۔

سوالات و جوابات

سوال

آپ نے مسلمانوں کے لیے قومی سطح پر نظام قائم کرنے کی بات کی، لیکن جب بات آئی بین الاقوامی نظام کی تو اس پر آپ نے دو طریقے تجویز کیے ہیں: طریقۂ حکما اور طریقۂ انبیا۔ اب دنیا کے اندر مسلمان سات ارب آبادی میں سے سوا ایک ارب کے قریب ہیں اور باقی لوگ غیر مسلم ہیں۔ ہر جگہ مسلمانوں کا یہی کہنا ہے کہ ہم نے اپنا نظام ساری دنیا پر نافذ کرنا ہے، تو دنیا ٹھیک ہوگی۔ اس کے بغیر نہیں۔ اس کے لیے آپ کیا تجویز (suggest) کرتے ہیں کہ کیا وہاں الرائی الکلی نہیں ہونی چاہیے؟ جیسے ہم اپنے تئیں رائی الکلی چاہتے ہیں تو پوری دنیا کے حوالے سے بھی رائی الکلی ہونی چاہیے، ان کے اندر ہمیں بھی اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہے۔ اور دوسروں کو بھی اپنی بات کہنے کا حق ہونا چاہیے۔؟

جواب

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو بات حکما اور انبیا کی کی گئی ہے، یہ بین الاقوامی نظام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ یہ تو قاعدہ اور ضابطہ قومی نظام کا بھی ہے اور بین الاقوامی نظام کا بھی ہے۔ دنیا کی ہر قوم کا قومی نظام دو طریقوں میں سے ایک پر ہوگا۔ اصولِ کلیہ کی بات ہو رہی ہے کہ ہر قوم اپنا قومی نظام یا تو حکما کے طریقے پر بناتی ہے یا انبیا کے طریقے پر بناتی ہے۔ اس کا صرف بین الاقوامیت سے کوئی تعلق نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنے جمہور کی اساس پر جو نظام بنائے گی، اس کی اچھائی کی جزا یا برائی کی سزا بھی تو اُسی کو بھگتنی ہے! ہم اس کو حق دیتے ہیں کہ جو جس اساس پر بنانا چاہتا ہے، بنائے، لیکن جس معاشرے میں مسلمان اکثریت میں ہیں تو اسلام کے بنیادی تقاضوں کے مطابق اُن کے ملک کے مطابق ہی نظام بنے گا۔ اور اگر کہیں یہودی ہیں، عیسائی ہیں، یا سوشلسٹ ہیں، ظاہر ہے، ہم وہاں تو اپنا نظام مسلط نہیں کریں گے۔ وہاں تو اُن کے مطابق اُن کا نظام وجود میں آئے گا۔

سوال

کیا خلافت کا مطلب شخصی نظام نہیں؟

جواب

نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ خلافت کا مطلب بھی بین الاقوامی اجتماع کا ہے۔ اور وہ بھی کل انسانیت کے انسانوں کا اجتماعی نمائندہ ہوگا۔ اور وہ بھی نمائندگی کو اُسی اجتماعیت کی اساس پر ہی قائم کرے گا۔

دوسری بات شاہ صاحبؒ جس حقیقت کو واضح کررہے ہیں، وہ یہ کہ اگر قدیم زمانے میں لوگوں نے **بسطة فی العلم و الجسم** (علمی وجسمانی صلاحیت) کی اساس پر کسی شخص کو اپنا حکمران بنایا بھی ہے تو دراصل اُس کے ساتھ بھی اُمرا، علما، فقہا یا اُن کی اجتماعیتوں کا اجتماعی ڈھانچہ کارفرما رہا۔ آج کی پولیٹیکل تاریخ میں بھی ایسی حکومت آمریت کہلاتی ہے کہ جس میں قانون سازی کے اختیارات بھی اُسی کے پاس ہوں، یعنی فرمانِ شاہی جاری ہوتا ہو۔ اس پر عمل درآمد کی انتظامیہ بھی وہ خود ہو۔ اس انتظامیہ کے بعد اُس کے جواز (Justification) کے لیے عدالتی اختیارات بھی اُسی شخصیت میں مرتکز ہوں۔ یہی آمریت کہلاتی ہے، یہی فاسد ملوکیت کہلاتی ہے۔ اور یہی دراصل شخصی حکومت ہے۔

اب آپ بتائیں اسلام کے اس چودہ سو سالہ تاریخ میں کیا جو خلیفہ یا حکمران ہوتا ہے، وہ شخصی قانون سازی کرتا تھا؟ نہیں! قانون ہمیشہ قرآن کا اور قرآن کی اساس پر جو مجتہدین کی یا علما کی جو فنی یا علمی قانون سازوں کی کمیٹی ہوتی تھی، وہ قانون کی بات کرتی تھی۔ حکمران کے پاس انتظامی اختیارات ہوتے تھے حتیٰ کہ عدالت بھی آزاد ہوتی تھی۔ اگر عدالت وقت کے حاکم کو اپنی عدالت میں بلا کر کیس کی سماعت کرتی ہے اور آزادانہ فیصلے کرتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عدالت آزاد ہے۔ تو جب جمہوریت یہ ہوتی ہے کہ قانون سازی ایک جماعت کرے، انتظامی اختیارات اس قانون پر عمل درآمد کے، دوسری جماعت کے پاس ہوں، انتظامیہ جسے کہا جاتا ہے۔ اور اُس پر چیک اینڈ بیلنس (check and balance) کا اختیار ایک تیسرے ادارے یعنی عدلیہ کے پاس ہو۔ اس کو اجتماعیت کہیں یا خلافت یا جمہوریت کا نام دیں۔ شاہ صاحبؒ اس کی ہی بات کرتے ہیں۔

سوال

کیا ریاست کی قومی تشکیل کا تصور، اسلامی ہے؟

جواب

قومی ریاستی تشکیل کے نظریے کو آپ کس اصول کے تحت کہیں گے کہ یہ غیر اسلامی ہے؟ سوسائٹی کی

تشکیل وترتیب تو انتظامی امور میں سے ہے۔ انتظامی امور بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً کبھی حجاز ایک صوبہ تھا، نجد ایک صوبہ تھا، آج دونوں مل کر ایک ملک بن گئے ہیں۔ انتظامی تقسیم کے امور جیسے بھی وقوع پذیر ہو جائیں، اُس میں اسلام کا سوفٹ وئیر (software) چل جائے گا۔ یوں سمجھ لو کہ قومی ریاستی تشکیل ایک ہارڈ وئیر (hardware) ہے۔ تو ہارڈ وئیر کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، جیسے ماضی میں کمپیوٹر بہت بڑے کمرے پر مشتمل، ہارڈ وئیر میں تھا۔ اب موبائل فون میں بھی ایک پورا کمپیوٹر ہے۔ تو گویا کہ اسلام ایک سافٹ وئیر ہے کہ جو ہر طرح کے انتظامی ڈھانچے میں اجتماعی مفاد کے حقوق کے تحفظ، عدل امن کے تحفظ کا بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کو آج سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سوال

یہ میری خلش ہے کہ وہ عدلیہ اور پارلیمنٹ جس نے قانون بنانا ہے، اس کی اکثریت جب قانون کا معنی نہ جانتے ہوں، یہاں شعبہ قانون سے وابستہ لوگ بھی بیٹھے ہیں۔ تو ایسے پارلیمان اور ایسے ادارے جہاں اُن کو اپنی حیثیت کا شعور نہ ہو، تو وہاں ہم لوگ کیا کریں گے؟ آپ ہمارے لیے اس میں راستہ بتائیے۔؟

جواب

منتخب نمائندوں کا جو کرائیٹیریا بیان کیا گیا ہے، وہی راستہ ہے کہ باشعور ہوں، قومی تقاضوں سے واقف ہوں، امورِ ریاست کو سمجھتے ہوں اور قومی حلقوں کے حقیقی نمائندے ہوں۔ وہ کرائیٹیریا آپ اختیار کریں گے اور اُس کی بنیاد پر جو پارلیمنٹ بنے گی، تو وہ انسانی سوسائٹی کے اجتماعی فیصلے کرے گی۔ اب آپ کی پارلیمنٹ کا حال تو یہ ہے کہ پوری پارلیمنٹ سور ہی ہوتی ہے۔ ابھی پنجاب اسمبلی میں خواتین کے حقوق کا بل پاس ہوا ہے۔ اور وہ انڈین قانون کا چربہ تھا۔ دیکھئے کہ آپ کے اس قانون کے کل دفعات ہی تیس (30) تھیں، انڈیا کے قانون کی دفعات چوراسی (84) تھیں۔ آپ کی پنجاب اسمبلی نے اس قانون میں یہ بھی منظور کر لیا کہ اس کی دفعہ تراسی (83) میں جو بات بیان کی گئی ہے، اس کو اپلائی (apply) کیا جائے گا۔ حال آں کہ اس قانون کے اندر دفعہ تراسی تھی ہی نہیں، مگر اراکین اسمبلی پاس کر کے آئے۔ اور پھر مستزاد یہ کہ خواتین کے لیے وہ قانون پاس ہوا تھا، مگر آپ نے دیکھا ہو گا ٹی وی پر کہ خواتین اراکین، اسمبلی سے باہر نکلیں تو ان سے پوچھا گیا کہ یہ قانون عورتوں کے تحفظ کے لیے بنا ہے، آپ ذرا اس کی وضاحت کر سکتی ہیں؟ تو کسی نے کہا میں سوئی ہوئی تھی، کسی نے کہا میرا پرس یہاں تھا، کسی نے کہا بہت اچھا قانون ہے۔ بس اس کے علاوہ انھوں نے کوئی بات نہیں کی ہے۔ خود بتائیے کہ اب ان کا منظور کردہ قانون اسمبلی کا منظور کردہ ہے یا چند مخصوص افراد کا منظور کردہ ہے۔

سوال

انسانی معاشرہ میں ''روایت اور رسم ورواج'' کی حقیقت کیا ہوتی ہے؟ اور اس حوالہ سے تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے؟

جواب

شاہ صاحبؒ نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انسان عقلی لحاظ اور اپنی مزاجی ترجیحات کے سبب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اس کے علاوہ حب جمال ولطافت، رائے کلی کے تقاضوں اور مفید تدابیر کی ایجاد واختراع اور غور وفکر کی صلاحیتوں کے حوالہ سے یکساں نہیں ہوتے، اسی وجہ سے ان میں ایک دوسرے کی صلاحیتوں، مہارتوں اور تجربات سے استفادہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور باہمی تعاون ان کی نوعی ضرورت قرار پاتی ہے، معاشرہ کے اہل عقل اور صاحب فہم وشعور انسانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کے مفاد میں مفید رہنمائی اور متعلقہ ایجادات پر توجہ دیں اور باقی افراد ان سے فائدہ اٹھائیں اور عوام الناس ان پر اعتماد اس لئے کرتے ہیں کہ ان میں اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ عقل ودانش، اخلاق عالیہ اور صالح ارتفاقات کی حامل اجتماعیت کی پیروی نہیں کریں گے تو انہیں مشکلات پیش آئیں گی اور زندگی جمود کا شکار ہو جائے گی کیونکہ رائے کلی اور حب جمال کے تقاضوں کی تکمیل انسان کے نوعی تقاضوں میں شامل ہے۔

شاہ صاحبؒ نے یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی معاشرہ میں روایات اور رواجات کی پذیرائی دو طریقوں سے ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ عوام الناس ان عناصر کی پیروی کرنے لگیں جو طاقت واقتدار کے مالک ہوں اور جن کی قوت کے سامنے وہ کسی قسم کی مزاحمت کرنے سے گریز کریں، یوں ان کے احکام کو قبول کر کے ان کو اپنا چلن بنالیں اور وہ ان میں رواج کی حیثیت اختیار کرلے اور دوسرے وہ اعلی اخلاق کی مالک شخصیات ہوتی ہیں جو معاشرہ کی اجتماعی فلاح کے لئے تدبر وحکمت کے ساتھ اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اور معاشرہ کی صالح اور فاسد روایات کو پرکھتی ہیں، صالح اجزاء کو فاسد اجزاء سے علیحدہ کر کے ان کو معاشرہ کی ترقی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ یہ فاسد رواج کے نقصانات سے لوگوں میں آگہی پیدا کرتے ہیں اور بنی نوع انسان کے تقاضوں کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں اور ان کے مطابق درست اور مفید رسوم واصول کو ترویج دیتے ہیں، اسی بنا پر کسی بھی معاشرہ کے عروج وزوال اور استحکام وانتشار میں ان عناصر کا کلیدی کردار ہوتا ہے جو عوام الناس میں اپنا مثبت یا منفی اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ اس لئے معاشرہ میں صالح روایات کا قیام وبقاء، وہاں کے شعور اور بصیرت رکھنے والوں کی فکری وعملی اجتماعی جدوجہد پر ہوتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے نظریۂ ارتفاقات میں فلسفۂ اجتماعیت کی وضاحت کی ہے۔ اور اس کے مراحل بیان کیے ہیں۔ ارتفاق کا لفظ بھی شاہ صاحبؒ کا اپنا خود ساختہ نہیں ہے۔ یہ قرآن کا استعمال کردہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے جہاں انعامات یا اچھی سوسائٹی کا تذکرہ آیا ہے، یا جنت میں اچھے حالات کا تذکرہ آیا ہے، تو وہاں لفظ استعمال کیا گیا حسنت مرتفقا اور جہاں بُرے نتائج کا تذکرہ ہے، وہاں ساءت مرتفقا۔ ذکر کیا گیا۔

ارتفاق کا مادہ رِفق ہے، یعنی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرنا۔ انسانی سوسائٹی کے تمام سماجی معاہدات اور تمام سطحوں میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانا اور آسانیاں پیدا کرنا، خواہ یہ آسانیاں علمی سطح پر ہوں یا عملی حوالے سے۔ ارتفاقاتِ عقلیہ اور ارتفاقاتِ معاشیہ، یعنی عقلی مسائل عقلی عقدے (cruxes) حل کرنے کے لیے جو قوانین اور ضابطے دریافت کیے جاتے ہیں، وہ عقل کے استعمال کی سہولتیں پیدا کرتے ہیں مثلاً ضرب، جمع تقسیم وغیرہ کے لئے کلکولیٹر کی ایجاد جیسی جتنی بھی دریافتیں آئی ہیں، یہ انسان کی ذہنی استعداد ہے۔ اسی طرح آج کمپیوٹر کا وجود میں آنا ہے۔ یہ وہ ارتفاقات یا سہولتوں کا نظام ہے، جس سے دماغی کام میں سہولت پیدا ہوتی ہے اور اس کے عقلی مسائل حل ہوتے ہیں۔ عقلی مشکلات کے حل کرنے کا جو صحیح طریق کار (method) ہے، وہ ارتفاقاتِ عقلیہ کہلاتا ہے۔ انسان کی دو بنیادی خصوصیات امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بیان فرمائی ہیں کہ انسان حیوانیت سے جب ممتاز ہوتا ہے تو ایک تو اُس میں زیادۃ القوۃ العقلیہ، یعنی اس کی قوتِ عقلیہ زیادہ اور بہتر ہوتی ہے۔ اور دوسرا براعۃ القوۃ العملیہ یعنی قوتِ عملیہ کی مہارت اور صلاحیت، تو قوتِ عقلیہ کے لیے سہولتوں کا جو نظام بنایا جاتا ہے، اُسے ارتفاقاتِ عقلیہ کہا جاتا ہے کہ عقل کو کام کرنے میں آسانی رہے کہ اس کو اگر کوئی مشکل درپیش ہو رہی ہے، تو اس کو حل کرنے کا طریقہ اس کے سامنے آجائے، جب کہ عملی مسائل کے حل کرنے کے لیے ارتفاقاتِ معاشیہ یا سوسائٹی کے سماجی معاہدات کے تمام سہولتوں کا نظام کام کرتا ہے۔

صدارتی کلمات

پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد چوہدری
قائم مقام وائس چانسلر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب، پروفیسر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب، اس تقریب کے مہمانِ خصوصی مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب اور حاضرین مجلس! السلام علیکم!

شعبہ علومِ اسلامیہ موسیٰ پاک شہید چیئر کے تحت چار روزہ لیکچر سیریز کا آخری دن اور اختتامی تقریب ہے۔ مہمان مقرر مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب کے چند علمی اور تفصیلی لیکچرز تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات و نظریات کو سمجھنے میں طلبا و طالبات اور اہلِ علم کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے۔ آج کے دور میں ایسے لیکچرز کی بہت ضرورت اور اہمیت ہے، تاکہ اسلام کو آج کے دور کے حوالے سے سمجھا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سیاسی، معاشی اور سماجی تعلیمات میں جو جدید فکرِ اسلامی کی بنیاد رکھی ہے، آج اس کو سمجھ کر اسلامی معاشرے میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس پروگرام کے انعقاد پر میں شعبۂ علومِ اسلامیہ اور موسیٰ پاک شہید چیئر دونوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ یہ شعبہ اس سے پہلے بھی ایسے پروگرام کراتا رہتا ہے، جو علم و تحقیق کے لیے بہت ضروری ہیں۔ بہت شکریہ۔

☆

شاہ صاحبؒ نے حکومتی ڈھانچے کی تشکیل کے حوالے سے ایک بڑی اہم بات 1735ء میں حجۃ اللہ البالغہ میں لکھی ہے اور اُسی زمانے میں البدور البازغہ لکھی ہے۔ روسو کا معاہدۂ عمرانی (Social Contract) تو 1762ء میں آیا ہے اور انقلابِ فرانس تو اس کے ساٹھ سال بعد آیا ہے۔ شاہ صاحبؒ اُس زمانے میں کہتے ہیں کہ

"لیس الإمام عندنا ھو الفرد الواحد الانسانی."

ہمارے نزدیک حکمران صرف ایک فردِ واحد کی آمریت یا شخصی حکومت کی بنیاد پر نہیں ہے اور مزید اس دور کے تقاضوں کے تناظر میں شاہ صاحبؒ نے بڑی اہم بات کہی کہ ہمارے نقطہ نظر سے ریاست کی تشکیل خاص طور پر اُن معاشروں میں، جہاں نقائص اور کمزوریاں موجود ہیں:

"اجتماع عقلاء القوم و مبرزیھم."

کی اساس پر ہوگی یعنی قوم کے عقل منداور منتخب لوگوں کا اجتماع یا پارلیمنٹ فیصلہ کرے گی۔ اس کے مطابق نظم مملکت چلایا جائے گا۔

واضح ہو کہ 1735ء میں جب ابھی یورپ کے ہاں جمہوریت کا کوئی تصور نہیں تھا، شاہ صاحبؒ یہ بات کہہ رہے ہیں، جو تین امور پر مشتمل ہے۔ ایک تو منتخب نمائندہ، جس کی اجتماعیت قائم کرنی ہے، وہ اس قوم میں سے ہو۔ مولانا سندھیؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو آدمی قوم میں سے نہیں ہوتا، وہ قوم کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ دوسری قوم کا فرد آپ کی مشکلات اور مسائل کی نمائندگی کیسے کر سکتا ہے؟ قوم میں سے ہونا ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ سمجھدار اور عقل مند ہو۔ اور تیسرا یہ کہ مبـــــرز یعنی منتخب ہو، وہ جو میدان میں تجربے، اپنے کردار، اپنے اعمال، اپنی عقلی، اپنی علمی و عملی خدمات کے تناظر میں یہ ثابت کر چکا ہو کہ وہ اس قوم کی نمائندگی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ گویا جاہل، بے وقوف، احمق، لاپرواہ انسان، ذاتی مفادات پر کام کرنے والا اور اجتماعیت کے لیے کوئی خدمت سرانجام نہ دینے والا آدمی، منتخب نمائندہ نہیں ہو سکتا اور ایسا فرد آگے نہیں آسکتا کیوں کہ خود وہ اپنی انفرادی سطح میں قوم کے لیے کوئی خدمات نہیں ادا کر سکتا تو اُس کی نمائندگی کیسے کرے گا؟

اور پھر جتنی جماعتیں اس سوسائٹی میں موجود ہوں، ان میں سے ان کا نمائندہ ہونا ضروری ہے۔ کسان ہیں، مزدور ہیں، زمین رکھنے والے ہیں، صنعت کار ہیں، تجارت والے ہیں، یعنی جن کی جماعت وجود میں آگئی ہو، جو قوم اپنی کمیونٹی اور اجتماعیت کی بنیاد پر ہے، ان میں سے نمائندہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ غریب عوام کا نمائندہ سرمایہ دار ہے، تاجر ہے، جس نے اپنا مال بیچنا ہے۔ یہ نہیں کہ مزدور اور کسان کا نمائندہ لینڈ لارڈ اور فیوڈل لارڈ ہو جو اپنے مفادات کے لیے نمائندگی کرتا ہے۔ بلکہ سوسائٹی میں جتنی موجود جماعتیں ہیں، ان کی نمائندگی اسی تناسب سے اس اجتماع کے اندر ہوگی۔

حضرت سید موسیٰ پاک شہیدؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے خانوادہ میں سے سولہویں صدی عیسوی کے مشائخ طریقت میں سے تھے۔ان کے نام سے 2010ء میں بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں تحقیقی مقاصد کے لئے ''موسیٰ پاک شہید چیئر'' قائم کی گئی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جیسی نامور شخصیت ان کے سلسلہ ارادت میں شامل تھی۔ شیخ محدث سے شیخ ابوالرضاء محمد دہلویؒ کو شرف تلمذ حاصل ہوا، ان سے ان کے بھائی شاہ عبدالرحیم دہلویؒ مستفید ہوئے اور ان کی تربیت میں ان کے جلیل القدر صاحبزادہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ علوم ومعارف کے حامل قرار پائے۔

موسیٰ پاک شہید چیئر کے زیر اہتمام 17 تا 20 اپریل 2017ء ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصر حاضر'' کے عنوان سے لیکچرز سیریز کا انعقاد کیا گیا۔ ملک کے صاحبِ فکر عالمِ دین مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری نے شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے سیمینار ہال میں خطبات پیش کئے۔ اس سیریز میں یونیورسٹی اساتذہ، طلبہ وطالبات کے علاوہ شہر سے بھی بڑی تعداد نے بھرپور دلچسپی لی، یہ خطبات اب تحریری صورت میں اہل علم کے ذوق مطالعہ کی نذر ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن

موسیٰ پاک چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان